اعلان داخلہ - قرآن کالج لاہور

① ایک سالہ "رجوع الی القرآن" کورس

قرآن کالج، لاہور میں ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ شروع ہے۔ جو اصحاب اپنی کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور دین کی بنیادی تعلیم (جس میں عربی گرامر، تجوید، مطالعۂ قرآن حکیم اور احادیثِ مبارکہ کا ایک منتخب نصاب اور ترجمۂ قرآن حکیم شامل ہے) حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں، ان کے لئے یہ ایک نادر موقع ہے۔ ~~انڈر گرایجویٹ اصحاب کے داخلے پر بھی غور ہو سکتا ہے۔~~

- داخلے ستمبر کے آخر تک مکمل ہو جائیں گے اور تدریس کا آغاز ان شاء اللہ شروع اکتوبر سے ہو گا۔
- داخلہ فارم ۲۱ ستمبر تک وصول کئے جائیں گے۔ داخلہ فارم موصول ہونے پر انٹرویو کی تاریخ سے بذریعہ ڈاک مطلع کر دیا جائے گا۔

تفصیلات کے لئے پندرہ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں

② بی۔اے، تربیتی سال

قرآن کالج، لاہور میں بی۔اے (تربیتی سال) کے لئے بھی داخلے جاری ہیں۔ داخلے ستمبر کے آخر تک مکمل کر لئے جائیں گے۔ داخلہ فارم ۲۱ ستمبر تک موصول ہو جانا چاہئے۔

- داخلہ فارم موصول ہونے پر انٹرویو کی تاریخ سے بذریعہ ڈاک مطلع کر دیا جائے گا۔
- انٹر کے نتیجے کے منتظر طلبا بھی درخواست دے سکتے ہیں۔
- کالج میں بی۔اے کے طلبہ کے لئے کمپیوٹر کی تعلیم کی سہولت بھی موجود ہے۔

تفصیلات کے لئے پندرہ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں

نوٹ

مندرجہ بالا دونوں کورسوں میں طلبہ کیلئے میرٹ کی بنا پر ایک ایک وظیفہ بھی دستیاب ہے!

المعلن: پرنسپل، قرآن کالج، لاہور، ۱۹۱۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۴ | ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۵ء | شمارہ ۹/۱۰

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شادی ہال۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۶۰ روپے، فی شمارہ -/۶ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

(اس شمارے کی قیمت -/۱۰ روپے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اول

فلسفہ اخلاق کی اہم ترین بحث یہ ہے کہ نیکی کی حقیقت کیا ہے؟ ہم کسی عمل کو اچھا یا برا قرار دیں تو کس بنیاد پر؟---اور یہ کہ کوئی شخص نیکی یا خیر کی راہ اختیار کیوں کرے' جبکہ برائی کی راہ کو اپنانے میں اسے فوری مسرت اور دنیوی منفعت حاصل ہوتی ہو؟---ان اخلاقی مباحث پر فلسفیانہ قیل و قال اور بحث و نزاع کی تاریخ بہت پرانی ہے' لیکن دیگر مابعد الطبیعی امور کی طرح ان کا کوئی ایسا تشفی بخش جواب جس پر تمام فلاسفہ کا اتفاق ہو جائے' آج تک تلاش نہیں کیا جا سکا اور نہ ہی مستقبل میں اس کا کوئی امکان ہے۔ اس کی وجہ بھی بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ عقل و منطق کے محدود پیمانوں سے ان مابعد الطبیعی مسائل کو ماپنا اور ان کا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ تاریخ فلسفہ خود عقلِ محض کی اس نارسائی کا زندہ ثبوت ہے۔ الٰہیات اور مابعد الطبیعی امور کے حوالے سے اقبال کا یہ کہنا صد فی صد درست ہے کہ

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں!

ان تمام امور کا کوئی حتمی اور تسلی بخش جواب اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف آسمانی ہدایت میں کہ جس کا کامل اور ہر اعتبار سے محفوظ ایڈیشن قرآن حکیم کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے لہٰذا بلاخوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قیامت تک یہ ہر نوع کی تحریف سے پاک رہے گا۔ یہ رشد و ہدایت کا وہ خورشیدِ تاباں ہے جو ابد الآباد تک نصف النہار پر چمکتا رہے گا۔ نیکی اور خیر سے متعلق فلسفہ اخلاق کی اس بحث کو بھی قرآن نے تشنہ نہیں چھوڑا۔ سورۃ البقرہ کی ایک ہی آیت (یعنی آیت نمبر ۱۷۷' جو اس سورۃ کی طویل آیات میں سے ہے) میں' جسے "آیۃ البر" کا عنوان دیا گیا ہے' اس بحث کے جملہ گوشوں کا اس جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور دل قرآن حکیم کی حقانیت کی گواہی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○

سورۃ البقرہ کی مذکورہ بالا آیت قرآن مجید کے ان مقامات میں سے ہے جن سے انجمن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد کو خصوصی شغف ہے۔ انہوں نے مطالعۂ قرآن حکیم کا جو منتخب نصاب مرتب کیا ہے اس کا دوسرا سبق اسی "آیۃ البر" پر مشتمل ہے۔ جن احباب نے محترم ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ درس سنا ہے وہ اس کی اثر پذیری سے بخوبی آگاہ ہیں۔

"حکمت قرآن" کے مدیر اعزازی ڈاکٹر ابصار احمد نے جو محترم صدر مؤسس کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں' اور جنہوں نے لندن یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے' چند سال

(باقی صفحہ ۷ پر)

سلسلہ تقاریر "تعارفِ الکتاب"

ڈاکٹر اسرار احمد

وَالْمُحْصَنٰتُ ۵

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○
وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ج كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ج
وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ
مُسٰفِحِیْنَ ط فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ
فَرِیْضَةً ط وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ ط
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا○ (النساء:۲۴)

قرآن مجید کا پانچواں پارہ جو "والمحصنٰت" کے نام سے موسوم ہے' پورے کا پورا سورۃ النساء پر مشتمل ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ ایک سو چھہتر (۱۷۶) آیات پر مشتمل ہے' جن میں سے تیئیس آیات سابقہ پارے یعنی چوتھے پارے میں آ چکی ہیں' ایک سو چوبیس آیات اس پارے میں شامل ہیں اور انتیس آیتیں چھٹے پارے میں شامل ہیں۔

اس سورۂ مبارکہ میں بھی دو سابقہ سورتوں یعنی سورۃ البقرہ اور سورۂ آلِ عمران کی طرح اُمتِ مسلمہ سے خطاب کیا گیا ہے اور اہلِ کتاب سے بھی۔ مزید برآں اس سورہ میں منافقین کے ساتھ بڑی تفصیل سے گفتگو ہوتی ہے۔ جہاں تک مسلمانوں سے خطاب کا تعلق ہے انہیں شریعت کے احکام کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ اس سورہ میں بالخصوص وہ احکام وارد ہوئے ہیں جو مسلمانوں

کی گھریلو زندگی اور مسلمانوں کے عائلی نظام سے متعلق ہیں یعنی شادی بیاہ کے قوانین۔ اس کے علاوہ معاشرے کو فحاشی اور بدکاری سے پاک کرنے کے لیے ابتدائی احکام اور ہدایات بھی اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہوئی ہیں۔ امتِ مسلمہ کے اصل فرضِ منصبی یعنی جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے اللہ کے دین کے غلبہ اور شہادت علی الناس پر تفصیلی بحثیں سورۃ البقرہ اور آلِ عمران میں آچکی ہیں۔ اس پارہ میں سورۃ النساء کا جو حصہ شامل ہے اس میں بھی مسلمانوں کو ان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بالخصوص شہادت علی الناس کے ضمن میں ایک بڑی عجیب بات اس پارے میں وارد ہوئی ہے یعنی یہ کہ قیامت کے روز جب انسانوں کا محاسبہ ہوگا تو امتوں اور قوموں کے حساب سے قبل اللہ تعالیٰ ان کے نبیوں اور رسولوں کو کھڑا کرے گا، جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا جو پیغام بذریعہ وحی ہم تک پہنچا تھا وہ ہم نے بلاکم و کاست ان تک پہنچا دیا تھا۔ اب یہ اپنے اس طرزِ عمل کے خود جواب دہ ہیں۔ یہ شہادت علی الناس کا اُخروی مظہر ہے۔ وہی چیز جو سورۃ البقرہ میں بیان کی گئی تھی کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: ۱۴۳)

اسی کا یہ دوسرا رخ اس جگہ پر آیا کہ اسی شہادت کا ظہور قیامت میں بھی ہوگا۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ (النساء: ۴۱)

"وہ دن کیسا ہوگا (اور اس روز کیا ہوگا) کہ جب ہم ہر امت کے خلاف ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو کھڑا کریں گے (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے خلاف گواہ بنا کر!"

اس آیت کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ میں ایک عجیب واقعہ وارد ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمائش کی کہ مجھے

قرآن سناؤ! انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ کو سناؤں! حالانکہ آپ ہی پر وہ نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور ہی لطف حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے سورۃ النساء کی تلاوت شروع کی' جب وہ اس آیت پر پہنچے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حَسْبُكَ، حَسْبُكَ" بس کرو! بس کرو! حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ اب جو میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ شہادتِ اُخروی کا وہ منظر جو ان آیات میں پیش کیا گیا ہے اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس درجہ شدید اثر ہوا۔

اس سورۂ مبارکہ میں دین کا جو اصل الاصول ہے' یعنی توحید' اس کی طرف بھی توجہ دلائی گئی' دو مرتبہ ان الفاظ میں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ

(النساء: ۴۸ و ۱۱۶)

"اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک برتا جائے (کسی کو اس کا ہمسر اور ندِّ مقابل ٹھہرایا جائے)' اس کے سوا اس سے کم تر جو گناہ ہیں وہ جس کو چاہے گا معاف فرمائے گا۔"

اہلِ کتاب سے خطاب کے ضمن میں تقریباً وہی باتیں دوبارہ اجمالاً سامنے لائی گئی ہیں جو اس سے پہلے سورۃ البقرہ اور سورۂ آلِ عمران میں آچکی ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کا جو حصہ اس پانچویں پارے میں آیا ہے اس میں سب سے تفصیلی گفتگو منافقین کے ساتھ ہوئی ہے' اگرچہ ان کو بھی خطاب کیا گیا "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا" ہی کے الفاظ سے' اس لیے کہ منافقین بھی بہرحال قانونی اعتبار سے' ظاہری اعتبار سے اُمتِ مسلمہ میں شامل ہیں۔ منافقین پر جو تین چیزیں سب سے زیادہ گراں گزر رہی تھیں ان کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا۔ پہلی چیز ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کلی اطاعت اور کامل متابعت۔ یہ چیز منافقین پر بڑی شاق تھی۔

وہ یوں کہ وہ اس کے لیے تو تیار تھے کہ ان سے نمازیں پڑھوائی جائیں، روزے رکھوالیے جائیں لیکن زندگی ہر معاملے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مطاع بنانا، انہی کی اطاعت کو لازم جاننا، یہ ان پر بڑا گراں گزرتا تھا۔ فرمایا: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (النساء: ۵۹) "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی" پھر فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيْمًا (النساء: ۶۵)

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے رب کی قسم یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ ہی کو حکم نہ بنائیں ہر معاملے میں کہ جو ان کے مابین اٹھ کھڑا ہو اور پھر آپ کے فیصلے کو تسلیم نہ کرلیں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ پوری شانِ تسلیم و رضا کے ساتھ' اس کیفیت کے ساتھ کہ ان کے دل میں اس فیصلے کے خلاف کوئی گھٹن موجود نہ ہو"

اس کے بعد دوسری چیز جو منافقین پر بہت گراں گزرتی تھی وہ جہاد اور قتال فی سبیل اللہ ہے یعنی اللہ کی راہ میں جان اور مال کا کھپانا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام تو انہی کے لیے آسان ہو سکتا ہے جو اللہ پر پختہ یقین رکھتے ہوں۔ جن کے دلوں میں روگ ہو، زیغ ہو، جن کا یقین موجود نہ ہو، جو صرف زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہوں اور ان کے دل اس کی تصدیق سے خالی ہوں، ان کے لیے یہ بات کسی طرح بھی آسان نہ ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی جان اور مال اللہ کی راہ میں کھپائیں۔ لہٰذا بڑی تفصیل کے ساتھ حکم دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں قتال کرو۔ یہی ایمان کا تقاضا ہے اور درحقیقت یہی ایمان کا عملی ثبوت ہے۔ اس کے ساتھ تیسری چیز جو منافقین پر بڑی گراں گزر رہی تھی وہ ہجرت کا حکم تھا یعنی اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے اپنے وطن کو خیرباد کہنا، اپنے گھر والوں سے، کنبے والوں سے، رشتے داروں سے تعلق منقطع کر کے، آباء و اجداد کی سرزمین کو خیرباد کہہ کر دارالاسلام' مدینہ منورہ' جو اب اسلام کا مرکز بن چکا تھا، وہاں آ جانا۔ ان لوگوں کے لیے تو آ جانا آسان تھا جو یقین رکھتے تھے اللہ پر اور ایمان لائے تھے

پورے صدقِ دل کے ساتھ لیکن جن لوگوں کو وہ یقینِ کُلّی حاصل نہیں تھا ان کے لیے یہ چیز بڑی کٹھن تھی۔ لہٰذا فرمادیا گیا کہ تمہارے ایمان کا ثبوت یہی ہے۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں ہجرت نہیں کرتے تو جان لو کہ تم اللہ کی شدید عقوبت کا اپنے آپ کو سزاوار اور حق دار ٹھہراؤ گے۔

منافقین کے ذکر میں اس پارے کے آخر میں بڑی شدید وعید وارد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگرچہ کفّار بھی بہت مغضوب ہیں، کھلے کافر اللہ کو انتہائی ناپسند ہیں، لیکن ان سے بھی کہیں بڑھ کر اللہ کو ناپسند ہیں منافقین کہ جنہوں نے لبادہ اسلام کا اوڑھا ہوا ہو، جو زبان سے اسلام کا کلمہ پڑھتے ہوں، جو زبان سے مدّعی ہوں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے، لیکن جن کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ، اور اس کے دین سے اپنی جان اور مال کو زیادہ محبوب رکھتے ہوں، جن کے لیے جہاد اور قتال بہت بھاری ہو گیا ہو، جن کے لیے اپنے وطن کو خیرباد کہنا اللہ کے لیے، اس کے دین کے لیے، بہت مشکل ہو گیا ہو۔ چنانچہ فرمایا گیا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج (النساء: ۱۴۵) یعنی منافقین جہنّم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور ان کو کفّار سے بھی بڑھ کر شدید سزا دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مہلک مرض سے بچائے رکھے۔

وآخر دعوانا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بقیہ : حرف اول

قبل "Ethical Virtue in the Quranic Perspective" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو پاکستان کے ایک مؤقر جریدے میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں انہوں نے آیۃ البر کے حوالے سے انہی افکارِ قرآنی کو سمویا ہے جن سے آگاہی انہیں محترم ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن کے ذریعے حاصل ہوئی تھی۔ تاہم ڈاکٹر ابصار احمد چونکہ فلسفے کے میدان کے آدمی ہیں لہٰذا ان کے مقالے میں وہ فلسفیانہ ٹچ (Touch) بھی موجود ہے جس کی ان سے بجا طور پر توقع تھی۔ چنانچہ اس طرح نہ صرف یہ کہ مضمون کی افادیت بڑھ گئی ہے بلکہ اس تناظر میں قرآن حکیم کی عظمت کا انکشاف بھی ایک بلند تر سطح پر ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارے کے انگریزی سیکشن میں افادۂ عام کی خاطر اسی مضمون کو شامل کیا گیا ہے۔ ○○

معاملہ کرایہ داری کی شرعی حیثیت

—— از مولانا محمد طاسین، صدر مجلس علمی، کراچی ——

معاملہ کرایہ داری جس کو عربی میں اجارہ کہا جاتا ہے اپنی حقیقت و ماہیت کے لحاظ سے عام طور پر ایک جانا پہچانا معروف معاشی معاملہ ہے جس میں ایک فریق اپنی کوئی منفعت بخش چیز دوسرے کو نفع اٹھانے کے لئے عارضی و وقتی طور پر دیتا اور اس کے عوض دوسرا اس کو بطور کرایہ کوئی مال وغیرہ ادا کرتا ہے۔

اسلام کے حقیقی ماخذ قرآن و حدیث کی رو سے معاملہ مذکور کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ جائز معاملہ ہے یا ناجائز؟ اگر جائز ہے تو بلا کسی کراہیت کے جائز ہے یا کراہیت کے ساتھ جائز ہے؟ بالفاظ دیگر یہ معاملہ بیّن طور پر حلال معاملہ ہے یا بیّن طور پر حرام معاملہ یا دونوں کے بین بین مشتبہ معاملہ ہے؟--- زیر نظر مضمون کا مقصد اسی مسئلہ سے بحث کرنا اور اس معاملہ کی شرعی حیثیت تحقیقی طور پر متعین اور واضح کرنا ہے۔

اس بحث و تحقیق کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کچھ عرصہ سے یہ مسئلہ اہل علم حضرات کے درمیان ایک شدید اختلافی مسئلہ بنا ہوا ہے، بعض حضرات معاملہ مذکور کے بلا کسی کراہیت کے جواز کے قائل ہیں جبکہ بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ یہ بالکل ناجائز اور سود کی طرح کا حرام معاملہ ہے۔ کچھ مدت پہلے وفاقی شرعی عدالت میں بھی یہ معاملہ زیر بحث آیا اور اس کی شرعی حیثیت کے متعلق مختلف اہل علم حضرات نے اپنے مفصل و مدلل بیانات پیش کئے اور عدالت نے سماعت فرمائے۔ مجھے بھی شخصی طور پر عدالت میں حاضر ہونے اور وہاں پڑھے جانے والے تحریری اور زبانی بیانات سننے اور جاننے کا موقع ملا، چنانچہ میں اس نتیجہ تک پہنچا کہ جن دلائل کی بنیاد پر معاملہ مذکور سے متعلق جو دو مختلف بلکہ متضاد موقف اختیار کئے گئے ہیں وہ کمزور ہیں، لہٰذا ان پر مبنی دونوں موقف بھی کمزور اور ناقابل اطمینان ہیں اور یہ کہ اس مسئلہ میں مزید بحث و تحقیق کی کافی

گنجائش ہے۔ اور چونکہ یہ مسئلہ اس لحاظ سے خاصا اہم ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور اس کے عملی اثرات و نتائج دور رس ہیں لہٰذا ضروری محسوس ہوا کہ اس پر اپنے علم و فہم کے مطابق کچھ لکھا جائے۔

اصل بحث میں پڑنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ فقہ کی بڑی کتابوں میں معاملہ اجارہ داری بمعنی کرایہ داری کے متعلق مختلف ابواب و فصول کے اندر اس کے جملہ پہلوؤں سے متعلق تفصیلی مباحث بڑے شرح و بسط کے ساتھ مذکور ہیں جو فقہاء کرام کی اعلیٰ ذہانت' فکری کاوش اور غیر معمولی باریک بینی اور دیدہ ریزی پر دلالت کرتے ہیں۔ جو شخص معاملہ کرایہ داری کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہے فقہ کی عربی اردو کتابوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں میرا مقصد' جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' صرف معاملہ کرایہ داری کی شرعی حیثیت متعین اور واضح کرنا ہے' ان تفصیلی مباحث و معلومات کو سامنے لانا نہیں جو کتب فقہ میں پائی جاتی ہیں۔ دوسری بات جو آغازِ بحث میں ہی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ کتب فقہ میں لفظ اجارہ دو مختلف معاشی معاملوں کے لئے استعمال ہوا ہے: ایک[1] اس معاملہ کے لئے جس میں ایک فریق اپنی کوئی منفعت بخش چیز جیسے مکان دوسرے کو نفع اٹھانے کے لئے وقتی طور پر دیتا اور دوسرا فریق نفع اٹھانے کے عوض پہلے فریق کو زر و نقدی وغیرہ کی شکل میں کوئی چیز ادا کرتا ہے۔ اس معاملے کا نام اردو میں معاملہ کرایہ داری ہے۔ اور دوسرے[2] اس معاشی معاملہ کے لئے جس میں ایک فریق دوسرے کے لئے کوئی مفید دماغی جسمانی کام و محنت کرتا اور دوسرا اس کام کے عوض پہلے کو کسی مال کی شکل میں اجرت ادا کرتا ہے۔ گویا مزدور اور ملازم کی حیثیت سے یومیہ اجرت یا ماہانہ تنخواہ پر کام کرنے کرانے کا معاملہ۔ میرے اس مضمون کا مقصد' معاملہ اجارہ داری کی پہلی قسم یا پہلی شکل سے بحث کرنا اور اس کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالنا ہے' یعنی مکان وغیرہ کی کرایہ داری کا معاملہ۔ اجارہ کی دوسری قسم یعنی اجرت پر کام کار کرنے کرانے کے معاملہ کو زیر بحث لانا اور اس کی شرعی حیثیت کا تعین کرنا نہیں' کیونکہ قرآن و حدیث کے واضح دلائل کی روشنی میں اس کی شرعی حیثیت قطعی طور پر متعین ہے یعنی یہ کہ وہ بلا کسی کراہیت کے ایک بالکل جائز و مشروع معاملہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ

اس کے جواز کے متعلق علماء کرام کے درمیان نہ کبھی پہلے کوئی اختلاف ہوا اور نہ آج موجود ہے۔ گویا اس کے جواز پر سب کا پوری طرح اتفاق و اجماع ہے' بخلاف کرایہ داری والے اجارہ کے کہ اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں علماء کے درمیان اس وجہ سے اختلاف ہے کہ قرآن و حدیث میں اس کے متعلق دو ٹوک اور واضح دلائل موجود نہیں جو اس کے جواز یا عدم جواز پر صریح الدلالت ہوں۔ اس کی تفصیل کچھ آگے آ رہی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ فقہ کی متداول کتابوں میں کتاب الاجارہ کے اندر فقہاء کرام نے بڑی تفصیل کے ساتھ جو تحریر فرمایا ہے اس میں معاملہ اجارہ داری کی مذکورہ بالا دو قسموں پر الگ الگ بحث نہیں کی گئی اور دونوں کے ثبوت اور جواز کے دلائل الگ الگ نہیں بیان کئے گئے۔ گویا ان کے نزدیک مذکورہ دو معاملوں کے درمیان کوئی فرق نہیں' دونوں ایک ہیں۔ ایک کے جواز کے جو دلائل ہیں وہی دوسرے کے جواز کے لئے بھی ہیں۔ حالانکہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے یہ دو معاملے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جو دلائل ایک کے جواز پر دلالت کرتے ہیں وہ دوسرے کے جواز پر دلالت نہیں کرتے۔ اللہ جانے ہمارے فقہاء کرام نے اس فرق کو کیوں ملحوظ نہیں رکھا اور سب سے پہلے کس کے ذہن میں کس وجہ سے مذکورہ دو معاملوں کے ایک ہونے کا خیال پیدا ہوا اور بعد والوں نے اسی پر اعتماد جاری رکھا۔

بہرحال اب میں وہ دلائل نقل کرنا چاہتا ہوں جو اپنی کتابوں میں فقہاء کرام نے کتاب الاجارہ کے اندر اجارے کے ثبوت و جواز میں قرآن و حدیث سے پیش فرمائے ہیں۔ یہ دلائل جمع کرنے کے سلسلہ میں مختلف فقہی مذاہب کی جن مستند کتابوں کے مباحثِ اجارہ کا میں نے مطالعہ کیا اور ان سے یہ دلائل نقل کئے ہیں ان کتابوں کے نام درج ذیل ہیں :

فقہ حنفی کی کتابوں میں المبسوط للسرخسی' بدائع الصنائع للکاسانی' البنایہ شرح الہدایہ للعینی۔ فقہ مالکی کی کتابوں میں الاکلیل شرح مختصر الخلیل' شرح الحرشی علی مختصر الخلیل' بدایۃ المجتہد لابن رشد۔ فقہ شافعی کی کتابوں میں تحفۃ المحتاج' فتح العزیز' تکملۃ المجموع۔ فقہ حنبلی کی کتابوں میں المغنی لابن قدامہ' شرح الکبیر لابن قدامہ۔ فقہ شیعہ کی کتابوں فقہ امام جعفر صادق اور فقہ ظاہری کی کتابوں میں سے المحلّٰی لابن حزم۔

مذکورہ کتب کے اندر اجارے کے جواز و ثبوت میں بطور دلیل قرآن مجید کی جو آیات نقل کی گئی ہیں وہ تعداد میں نو ہیں' جن کی تفصیل اس طرح ہے۔ جو تین آیات سورۃ القصص سے لی گئی ہیں ان میں سے :

پہلی آیت (نمبر۲۵) : ﴿ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ﴾ ترجمہ : شیخ مدین کی صاحبزادی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا : میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تا کہ آپ کو بطور جزاء اس کام کی اجرت ادا کریں جو آپ نے ہمارے ریوڑ کو پانی پلانے میں انجام دیا ہے۔

دوسری آیت (نمبر۲۶) : ﴿ یٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ۝ ﴾ ترجمہ : شیخ مدین کی ایک صاحبزادی نے والد سے عرض کیا : ابا جان آپ اس شخص کو ملازم رکھ لیجئے کیونکہ آپ کا مقرر کردہ بہتر ملازم اور نوکر وہ ہو سکتا ہے جو طاقتور ہونے کے ساتھ امانت دار بھی ہو' سو یہ دونوں خوبیاں اس میں موجود ہیں۔

تیسری آیت (نمبر۲۷) : ﴿ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هَاتَیْنِ عَلٰی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ﴾ ترجمہ : شیخ مدین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا : میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کے ساتھ آپ کا نکاح کر دوں اس عہد و پیمان پر کہ آپ آٹھ سال تک میری نوکری و خدمت کریں گے۔

چوتھی آیت سورۃ الکہف کی آیت نمبر۷۷ ہے : ﴿ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا ۝ ﴾ ترجمہ : حضرت موسیٰ علیہ السلام نے علم لدنی رکھنے والے بندۂ مومن (حضرت خضر) سے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو دیوار کے ٹھیک کرنے پر ان لوگوں سے اجرت لے سکتے تھے۔

پانچویں آیت سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ ہے : ﴿ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَکُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ ترجمہ : اور اگر تم اپنے شیر خوار بچوں کو ان کی مطلقہ ماؤں کے علاوہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کچھ حرج نہیں جب تم اس کو عرف کے مطابق اجرت ادا کرو۔

چھٹی آیت سورۃ الطلاق کی آیت نمبر۶ ہے : ﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ ترجمہ : پھر اگر وہ مطلقہ بیویاں تمہارے لئے تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں تو ان کو ضرور اس کی اجرت دو۔

ساتویں آیت سورۃ الزخرف کی آیت ۳۲ ہے : ﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ ترجمہ : اور ہم نے اونچا کیا بعض انسانوں کو دوسرے بعض پر درجات و مراتب میں تاکہ ان کے بعض دوسرے بعض سے کام و خدمت لے سکیں۔

آٹھویں آیت سورۃ الجمعہ کی آیت نمبر۱۰ ہے : فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ترجمہ : پس جب صلوٰۃ جمعہ ادا ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل طلب و تلاش کرو۔

نویں آیت سورۃ البقرہ کی آیت نمبر۱۹۸ ہے : ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ترجمہ : پس تم پر کچھ حرج و مضائقہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل طلب و تلاش کرو۔

یہ ہیں وہ نو قرآنی آیات جو کتب مذکورہ میں مختلف فقہاء کرام نے معاملہ اجارہ کے جواز میں بطور استدلال پیش فرمائی ہیں۔ لیکن ان آیات کا بغور جائزہ لینے اور ان کے مفہوم و مطلب پر گہری نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق اجارہ بمعنی کسی انسان کا دوسرے انسان سے اجرت پر کام کرنے کرانے سے ہے' کوئی منفعت بخش چیز دوسرے کو نفع اٹھانے اور اس کا معاوضہ لینے دینے والے اجارہ سے نہیں' یعنی زیر بحث کرایہ داری والے اجارہ سے نہیں جس کی شرعی حیثیت کا تعین مقصود ہے۔

اس اجمال کی تفصیل کے لئے ضروری ہے کہ مذکورہ آیات میں سے ہر آیت کے مفہوم و مطلب پر روشنی ڈالی جائے۔ ان میں سے پہلی تین آیات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قصہ سے تعلق رکھتی ہیں جو قرآن مجید کی سورۃ القصص میں بیان ہوا ہے۔ وہ قصہ اس طرح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر میں تھے تو ان سے ایک واقعہ سرزد ہوا جو قتل خطاء کا اتفاقی حادثہ تھا۔ یہ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے جب آپ نوجوان تھے بہرحال

اس کے نتیجے میں ان کو مصر چھوڑنا پڑا' کئی روز کے پیدل سفر کے بعد وہ ایک مقام پر پہنچے جس کا نام مدین تھا اور ملک شام میں واقع تھا۔ آبادی کے باہر ایک کنویں کے قریب درختوں کے سایہ میں تھکے ماندے بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ چرواہے لوگ کنویں سے پانی نکال کر اپنے ریوڑوں کو پلا رہے ہیں اور کچھ فاصلہ پر دو خواتین اپنے ریوڑ کو لئے کھڑی اس انتظار میں پریشان ہیں کہ مرد لوگ اپنے ریوڑوں اور گلوں کو پانی پلا کر ہٹیں تو وہ بچا کھچا پانی اپنے ریوڑ کو پلائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی حالت پر رحم آیا اور ان سے پوچھا کہ تم کیوں دور کھڑی ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے والد بوڑھے ہو چکے ہیں اور ہمیں مجبوراً اپنے ریوڑ کی دیکھ بھال کرنی پڑ رہی ہے' کوئی مرد ہمارے ساتھ نہیں جو یہ کام کرے' ہمارا یہ معمول ہے کہ جب دوسرے سب لوگ چلے جاتے ہیں تو آخر میں اپنے ریوڑ کو پانی پلاتی ہیں۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام فوراً کنویں کی طرف گئے اور پانی نکال کر ان کے ریوڑ کو پلایا۔ چنانچہ وہ آج خلاف معمول کچھ جلدی اپنے گھر پہنچیں تو والد بزرگوار نے وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتلایا کہ آج ایک اجنبی مسافر نے ہمارے حال پر رحم کھاتے ہوئے کنویں سے پانی نکالا اور ہمارے ریوڑ کو پلایا لہٰذا ہم اور دنوں کی بہ نسبت آج جلدی گھر آ گئیں۔ یہ سن کر بزرگوار نے اپنی ایک بیٹی سے کہا جاؤ اور اس مسافر سے کہو کہ میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تا کہ وہ آپ کو اس کام کا کچھ صلہ پیش کریں جو آپ نے ازراہ کرم ہمارے لئے انجام دیا ہے۔ چنانچہ اس شریف زادی کے کہنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد اس بزرگ نے حضرت موسیٰ سے دریافت کیا کہ تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پورا ماجرا کہہ سنایا۔ بزرگ نے قصہ سن کر تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو ظالموں سے چھٹکارا دیا' آپ کچھ فکر نہ کریں اور ہمارے پاس اطمینان کے ساتھ گھر کے ایک فرد کی طرح رہیں۔ اسی دوران بزرگ کی ایک صاحبزادی نے والد بزرگوار سے عرض کیا کہ آپ کو ایک گھریلو نوکر کی ضرورت تھی' سو آپ ان کو نوکر رکھ لیں' یہ ہر کام کرنے کی جسمانی طور پر قوت و طاقت بھی رکھتے ہیں اور امین و دیانتدار بھی ہیں' کیونکہ ایک اچھا نوکر و ملازم وہی ہوتا ہے جو قوی اور امین ہو اور یہ

سکیں جن پر تمدن و اجتماع کے قیام و بقا کا دار و مدار ہے۔ اس آیت کے آخری جملے :
"لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا" سے یہ استنباط ہو سکتا ہے کہ لوگ اجرت پر ایک دوسرے سے کام خدمت لے سکیں اور ایک دوسرے کی معاشی ضرورت پوری کر سکیں لہٰذا اس آیت سے بھی اگر جواز نکلتا ہے تو کرایہ داری والے اجارہ کا نہیں بلکہ اجرت پر کام کرنے کرانے والے اجارہ کا نکلتا ہے' جو اس مضمون میں ہمارے زیر بحث نہیں۔

آٹھویں آیت کے سیاق و سباق اور مفہوم و مطلب کو دیکھا جائے تو اس کو جوازِ اجارہ کے ثبوت میں پیش کرنا عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کا نہ صرف یہ کہ کرایہ داری والے اجارہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اجرت پر کام کرنے کرانے والے اجارہ سے بھی واضح اور قریبی تعلق نہیں۔ اس آیت سے متصل پہلی آیت میں اللہ کا فرمان ہے کہ اے صاحبانِ ایمان! جمعہ کے دن جب صلوٰۃِ جمعہ کے لئے اذان ہو تو صلوٰۃ کے لئے مسجد کی طرف چل پڑو کہ خرید و فروخت وغیرہ چھوڑ دو۔ اس کے بعد کی مذکورہ آیت میں ارشاد ہوا "پس جب صلوٰۃ جمعہ ادا ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور رزق تلاش کرو"۔ یعنی نماز جمعہ کی وجہ سے جو معاشی کاروبار اور اشغال آپ نے چھوڑے ان کو دوبارہ اختیار کر لو' یعنی تم پر کاروبار چھوڑنے کی جو پابندی لگائی گئی تھی وہ ادائیگیٔ صلوٰۃ کی خاطر تھی' چنانچہ جب صلوٰۃ ادا ہو گئی تو یہ پابندی بھی ختم ہو گئی' لہٰذا اب تمہیں دوبارہ کاروبار میں مشغول ہو جانا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ نماز کی وجہ سے جو کاروبار چھوڑے اور پھر نماز کے بعد اختیار کئے جا سکتے ہیں ان میں مکان وغیرہ کی کرایہ داری کا معاملہ نہیں آتا کیونکہ یہ زراعت' صنعت اور تجارت کی طرح کا معاملہ نہیں جن کو چھوڑے بغیر نماز ادا نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ کہ اس میں مشغول ہوتے ہوئے بھی نماز ادا ہو سکتی ہے' مثلاً جس نے کرائے پر مکان دے یا لے رکھا ہو چونکہ اس معاملے کے موجود ہوتے ہوئے مالک مکان بھی نماز ادا کر سکتا ہے اور کرایہ دار بھی ادا کر سکتا ہے لہٰذا یہ ان معاملات کے زمرے میں نہیں آتا جن میں مشغولیت ادائیگیٔ صلوٰۃ کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ البتہ اجرت پر کام کرنے کرانے کا معاملہ ضرور ایسا ہے جس میں مشغول رہنا ادائیگیٔ صلوٰۃ کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے لہٰذا وہ ان معاملات کی فہرست میں شامل ہے جو ادائیگیٔ صلوٰۃ کے لئے چھوڑے اور فراغتِ صلوٰۃ کے بعد اختیار

کیے جاسکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اگرچہ دور کا اور عمومی تعلق سہی لیکن اس آیت کا اگر تعلق ہو سکتا ہے تو صرف اس اجارے سے ہو سکتا ہے جس کا مطلب ہے اجرت پر کام کرنا کرانا' اس اجارے سے نہیں جس کا مطلب ہے کوئی نفع بخش چیز دوسرے کو نفع اٹھانے کے لئے دینا اور اس سے اس کا معاوضہ وصول کرنا' جو ہمارے زیر بحث ہے اور جس کی شرعی حیثیت متعین کرنا ہمارا مقصود ہے۔

نویں آیت کا بھی تقریباً یہی حال ہے' بظاہر اس کا اجارے سے کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا۔ شاید اس کو اجارے کے ثبوت میں پیش کرنے کا سبب وہ روایت ہو جو اس آیت کے شان نزول میں مفسرین کرام نے بیان کی ہے جس کا مضمون کچھ اس طرح ہے : ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا : ہمارا پیشہ ساربانی کا ہے' ہم لوگوں کو اپنے اونٹوں پر سوار کر کے اِدھر اُدھر لے جاتے اور ان سے کرایہ لیتے اور گزر بسر کرتے ہیں۔ خصوصاً حج کے موسم میں ہم عازمین حج کو مقاماتِ حج پر لے جاتے اور پھر حج کے بعد واپس لاتے ہیں اور اس موقع پر ہم خود بھی حج کی سعادت حاصل کر لیتے ہیں' کیا اس صورت میں ہمارا حج ادا ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ حرج تو واقع نہیں ہوتا؟ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ تامل فرمایا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب ہے کہ حج کے سفر میں کوئی معاشی مشغلہ اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے ساتھ جس نے مناسکِ حج صحیح طریقے سے ادا کیے اس کا حج بغیر کسی حرج کے ہو جاتا ہے۔ اس آیت کے اندر یہ جو الفاظ ہیں کہ ﴿اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ان کا مفہوم عام ہے جس میں خرید و فروخت اور محنت مزدوری کے تمام معاشی مشاغل آجاتے ہیں۔ جن لوگوں کے سوال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ان کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ دوران سفر اپنے سواری کے اونٹ مسافر حاجیوں کے سپرد نہیں کرتے تھے کہ وہ جس طرح چاہیں ان سے کام لیں اور ان کے کھانے پینے وغیرہ کی ذمہ داری ان پر ہو' بلکہ وہ اپنے اونٹوں کو اپنی حفاظت و نگرانی میں رکھتے' ان کو کھلاتے پلاتے' ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال کرتے' پورے سفر میں ان کے ساتھ پیدل چلتے' درمیانی منزلوں میں مسافروں کو اتارتے چڑھاتے اور اپنا اور اپنے اونٹوں کا خرچہ خود اٹھاتے۔ غرضیکہ وہ اس پیشہ میں مالی خرچہ کے ساتھ مسلسل محنت و

مشقت برداشت کرتے اور اس کے صلہ میں ان کو مسافروں کی طرف سے بطور کرایہ جو کچھ ملتا وہ ان سب کاموں کا معاوضہ ہوتا جن کا اوپر ذکر ہوا۔ گویا ان کے اونٹوں کی حیثیت کرائے کے مکانوں کی نہ تھی بلکہ ان آلات و اوزار اور ان ذرائع و وسائل کی تھی جن کے ساتھ کوئی صاحبِ ہنر و پیشہ کام کرتا اور رزق و مال کماتا ہے بلکہ انکی زیادہ بہتر مثال ٹیکسی کی ہے جس کو اس کا مالک خود چلاتا' اپنی جیب سے اس میں پٹرول وغیرہ ڈالتا اور اسے اپنی نگرانی میں رکھتا ہے اور اپنے دماغی و جسمانی کام کاج اور مالی اخراجات کے بدلے سواریوں سے کرایہ لیتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ روایت کی رو سے ان ساربان لوگوں کا جو کام تھا وہ دراصل اجارہ بمعنی اجرت پر کام کرنے کرانے کا معاملہ تھا۔ تو پھر اس نویں قرآنی آیت سے بھی جس اجارے کا جواز فراہم ہوتا ہے وہ مکانوں وغیرہ کی کرایہ داری والا اجارہ نہیں بلکہ اجرت پر کام اور محنت کرنے کرانے والا اجارہ ہے جس کی شرعی حیثیت متعین اور واضح ہے۔

اجارہ سے متعلق قرآنی آیات پر تفصیلی بحث کے بعد اب وہ احادیث و آثار پیش کرتا ہوں جو مختلف فقہاء کرام نے متفرق طور پر اپنی کتابوں کے اندر اجارے کے ثبوت و جواز میں بیان فرمائے ہیں' بغیر اس تفصیل کے کہ ان میں سے کس کو کس فقیہ نے کس کتاب میں ذکر کیا ہے۔ یہ روایات تعداد میں آٹھ ہیں :

(۱) عن ابی هریره رضی اللّٰه عنه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم' قال : قال اللّٰهُ تعالٰی : ثَلاثةٌ انا خصمُهم یومَ القیامةِ : رجلٌ اُعطِیَ بِی ثم غدَر' ورجلٌ باع حرًّا فاَکل ثمنَه' ورجلٌ استاَجراَجیرًا فاستوفٰی منه ولم یُعطِ اجرَه
(صحیح البخاری' ج ا' ص ۳۰۲)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کے ساتھ قیامت کے دن میرا رویہ مخاصمانہ ہو گا اور سختی سے پیش آؤں گا' ایک وہ آدمی جس نے میری قسم کے ساتھ کسی سے عہد و پیمان کیا' پھر اس کی خلاف ورزی کی۔ دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد انسان کو بیچا اور حاصل شدہ مال کھایا' اور تیسرا وہ آدمی جس نے کسی مزدور کو کام پر لگایا اور اس سے پورا کام لیا لیکن اس کو اس کی اجرت و مزدوری

نہ دی"۔

(۲) عن ابی هریرہ رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال : مَنِ اسْتَأْجَرَ اَجِیْرًا فَلْیُعْلِمْہُ اَجْرَہ

(السنن الکبریٰ ' ج ٦ ' ص ۱۲۰)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جو شخص کسی مزدور سے کام کرائے' اس پر لازم ہے کہ وہ اس (مزدور) کو اس کی اجرت کی مقدار بتلادے"۔

(۳) عن ابی هریرہ رضی اللّٰہ عنہ قال : قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : اَعْطِ الاَجِیْرَ اَجْرَہ قبلَ اَنْ یَّجِفَّ عِرْقَہ

(السنن الکبری ' ج ٦ ' ص ۱۲۱)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مزدور کو اس کی مزدوری فوراً ادا کردو قبل اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو"۔

(۴) عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما قال احتَجَم النَّبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم واَعطیَ الحَجامَ اَجْرَہ

(صحیح البخاری ' ج ۱ ' ص ۳۰۴)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنی لگوائی اور حجام کو اس کی اجرت عطا فرمائی"۔

(۵) عن جابر رضی اللّٰہ عنہ قال : قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : 'اجرتُ نفسی من خدیجۃ رضی اللّٰہ عنہا سفرتَینِ بِقلوصٍ (السنن الکبریٰ للبیہقی ' ج ٦ ' ص ۱۱۸)

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : میں نے بحیثیت اجیر کے حضرت خدیجہؓ کے لئے جو تجارتی سفر کئے ہر سفر کی اجرت ایک جوان اونٹنی مقرر ہوئی تھی"۔

(٦) عن عائشۃ رضی اللّٰہ عنہا قالت : استأجَرَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وابوبکر رجلاً من بنی الدئیل هادیًا خریتًا وهو علی دین کفار قریش ' فدفعَا الیہ راحِلتَیہِمَا و

وعداه غار ثور بعدَ ثلاثٍ' فأتاهُما فارتحلا وانطلق معهما عامرُبن فهيرة والدليل الدئيلى فاخذ بهم طريق الساحل (صحيح البخاری' ج۱' ص۳۰۱)

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہانے روایت کرتے ہوئے فرمایا : ہجرت کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنی دئیل کے ایک شخص سے اجرت پر معاملہ کیا' جو تھا تو کافر مشرک لیکن مکہ اور مدینہ کے درمیان مختلف راستوں سے خوب واقف اور آگاہ تھا۔ دونوں نے اپنی سواریاں اس کے سپرد کردیں اور یہ طے پایا کہ تین دن کے بعد وہ ان سواریوں کو لے کر غارِ ثور پر آجائے' چنانچہ وہ حسب وعدہ پہنچا اور آپ حضرات اپنی اونٹنیوں پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف چل پڑے۔ حضرت ابوبکر صدیق کا ایک غلام عامر بن فہیرہ بھی تیسرا رفیقِ سفر تھا اور چوتھا راستہ دکھانے والا دئیلی تھا جو ان کو پہاڑی راستہ کی بجائے ساحلِ سمندر کے راستہ سے لے کر چلا جو عام راستہ نہ تھا"۔

(۷) عن علیّ رضی اللّٰہ عنه اِنَّهٗ اجَرَ نفسَه مِن یهودیٍّ یَستقِی لَه کلَّ دلوٍ بِتمرةٍ۔

"حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک یہودی کا کام متعین اجرت پر کیا' کام کنویں سے پانی کے ڈول نکال کر باغ کو سیراب کرنا تھا اور اجرت ہر ڈول کے عوض ایک چھوہارہ تھی"۔

آٹھویں حدیث کو ایک کتاب میں بغیر راوی کے نام کے اس طرح بیان کیا گیا ہے :

ورُوِیَ انّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم مرَّعلٰی رافع بن خدیج وهو فی حائطِهٖ فاَعجبَه فقال : لِمَن هذا الحائطِ؟ فقال : لِی یارسولَ اللّٰہ' اسْتَاْجرتُه' فقال رسولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیه وسلم : لَاتَسْتاْجِرهُ بشَیءٍ مِنهُ۔

"روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رافع بن خدیج کے پاس سے گزرے جبکہ وہ اپنے کھیت میں تھے۔ کھیت کی لہلاہٹ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت خوش کیا۔ پس آپؐ نے رافع بن خدیج سے پوچھا : یہ کھیتی کس کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میری' اور میں نے اس کو اجارے پر لیا ہے۔ اس پر رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اس کو اس سے کسی شے کے اجارے پر نہ لو۔"

یہ ہیں وہ آٹھ احادیث و آثار جن کو اجارے کے جواز کی بحث میں متفرق کتابوں کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ پہلی سات احادیث و روایات سے صاف صراحۃً ظاہر ہوتا ہے کہ اجارے کا معاملہ جائز ہے' لیکن یہ اجارے کا وہ معاملہ ہے جو دو انسانوں کے درمیان اجرت پر کام کرنے کرانے کے لئے طے پاتا ہے نہ کہ وہ معاملہ جو کسی مکان وغیرہ کے مالک اور کرایہ دار کے درمیان طے پاتا ہے' جو ہمارے زیر بحث ہے۔

جہاں تک آٹھویں حدیث کا تعلق ہے' جن الفاظ کے ساتھ بغیر سند کے یہ ذکر کی گئی ہے' صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مذکور نہیں' سنن ابی داؤد میں یہی حدیث جن الفاظ سے بیان ہوئی ہے وہ یہ ہیں :

> عن ابن ابی نعم قال : حدثنی رافع بن خدیج انہ زرع ارضًا فمرّ بہ النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو یسقیھا فسألہ لِمَن الزّرع وَلِمَن الارض؟ فقال : زَرعی ببذری وعَمَلی لی الشطر وَلبنی فلان الشطر' فقال اَرْبَیْتُمَا' فردّ الارض علی اھلھا وخُذ نَفقَتِک (ج ۲' ص ۱۲۷)

> "ابن ابی نعم نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ مجھ سے حضرت رافع بن خدیج نے یہ حدیث بیان کی کہ اس نے ایک زمین کاشت کی۔ ایک موقع پر وہاں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا جبکہ وہ کھیتی کو سیراب کر رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ یہ کھیتی کس کی ہے اور زمین کس کی؟ اس نے جواب میں عرض کیا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور محنت سے ہے اور زمین بنی فلان کی' اور معاملہ اس طرح طے پایا ہے کہ نصف پیداوار میرے لئے ہوگی اور نصف بنی فلاں کے لئے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : تم ربا میں مبتلا ہوئے۔ پس زمین ان کے مالکوں کو لوٹا دو اور تمہارا اس میں جو خرچہ ہوا ہے وہ ان سے لے لو"۔

علاوہ ازیں رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے حوالے سے کتب حدیث میں متعدد ایسی روایات بھی موجود ہیں جو کراء الارض اور مزارعت کی ہر شکل کو ناجائز و ممنوع بتلاتی ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "مروجہ نظام زمینداری اور اسلام" میں حضرت رافع بن خدیج

سے مروی سترہ احادیث مختلف کتابوں سے نقل کیں اور ان پر تبصرہ لکھا ہے' اگر کوئی ان کو دیکھنا چاہے تو اس مطبوعہ کتاب میں دیکھ سکتا ہے۔

غرضیکہ کراء الارض سے متعلق حضرات رافع بن خدیج کی کسی ایک روایت کے بعض الفاظ سے یہ مطلب نکالنا کہ پیداوار زمین کے ایک حصے کے سوا باقی کسی چیز مثلاً نقد دراہم و دنانیر کے عوض زمین کو اجارے پر دینا لینا جائز ہے' لہٰذا مکانات کو بھی کرایہ پر دینا جائز ہونا چاہئے' ایک بہت کمزور استدلال ہے کیونکہ ایک متنازع اور مختلف فیہ معاملہ پر جس کے جواز و عدم جواز میں ائمہ مجتہدین کے مابین واضح اختلاف موجود ہے کسی دوسرے معاملہ کے جواز کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا قیاس اصولاً درست نہیں ہوتا۔

(جاری ہے)

قرآن اکیڈمی کامرس کالج (انگلش میڈیم)

سال اول انٹرمیڈیٹ میں داخلے جاری ہیں

انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام تعلیمی سال ۹۶-۱۹۹۵ء سے قرآن اکیڈمی کامرس کالج (برائے طلباء) کا آغاز کیا جارہا ہے۔

چونکہ امت مسلمہ کا احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ ایسے ذہین' خدا ترس اور تعلیم یافتہ افراد کی کوششوں سے ممکن ہے جن کی فکر حکمت قرآنی کی محکم بنیاد پر قائم ہو اور جو ساتھ ساتھ دنیوی علوم پر بھی دسترس رکھتے ہوں۔ لہٰذا قرآن اکیڈمی کامرس کالج میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے مقررہ مضامین کے علاوہ ابتدائی عربی گرامر' تجوید اور قرآن حکیم کے منتخب حصوں کی لازمی تدریس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

قرآن اکیڈمی کامرس کالج میں داخلے کے لئے پراسپکٹس اور داخلہ فارم بعوض پچاس روپے دستیاب ہیں۔ داخلہ فارم جمع کرانے کی آخری تاریخ ۷ ستمبر ۱۹۹۵ء ہے۔

ڈی۔ایم۔۵۵' خیابان راحت' ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی

فون : 5855219 ' 5854036

علّامہ اقبال کے دو شعروں کی تشریح

از : ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ﷺ ما را
حسابِ من ز چشمِ اُو نہاں گیر

مندرجہ بالا اشعار "ارمغانِ حجاز" سے لئے گئے ہیں۔ "ارمغان حجاز" کی پہلی اشاعت ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی، یعنی حضرت علامہ کی زندگی کے آخری سال۔ "ارمغانِ حجاز" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ تحفہ ہے جو علامہ نے رسول مقبول ﷺ سے حاصل کیا۔ یوں تو علامہ اقبال کی ساری زندگی عشقِ رسول ﷺ سے معمور تھی لیکن جوں جوں زندگی کے دن گزرتے گئے اقبال کی نبی اکرم ﷺ سے والہانہ محبت اور الفت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ آخری عمر میں جب ان کی مجلس میں نبی اکرم ﷺ کا ذکر آتا یا مدینہ منورہ ہی کا تذکرہ ہوتا تو وہ بے قرار ہو جاتے، آنکھیں نم ناک ہو جاتیں، یہاں تک کہ آنسو رواں ہو جاتے۔

علامہ اقبال ۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو سر سید راس مسعود کو لکھتے ہیں :

"میری صحت دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی فرق آ رہا ہے۔ ان شاء اللہ دربارِ رسالت میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، قبول ہو گا۔ امسال دربارِ حضور ﷺ میں حاضری کا قصد تھا مگر بعض موانع پیش آ گئے۔ ان شاء اللہ امید ہے کہ سال (آئندہ) حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانانِ ہند یاد کریں گے"۔(۱)

علامہ اقبال خود تو حجاز نہ جا سکے لیکن محبت اور شوق کے زور سے جو تحفہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے وصول کیا اس کا نام "ارمغانِ حجاز" رکھ گئے۔ مکاتیب اقبال (۲) سے معلوم

ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اسی مفہوم کی ایک اور رباعی لکھی تھی جو پروفیسر محمد رمضان عطائی نے آپ سے مانگ لی تھی۔ پروفیسر محمد رمضان میانوالی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے نام جو جواب علامہ اقبال نے پوسٹ کارڈ پر تحریر کیا تھا وہ مکاتیب میں ملتا ہے۔ وہ رباعی تو بہت ہی مشہور اور زبان زدِ عام ہے لیکن علامہ اقبال نے چونکہ انہیں دے دی تھی اس لئے اپنے کلام میں درج نہیں کی۔ وہ رباعی یہ ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم مَن فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

علامہ اقبال کے ان اشعار کا تعلق PERSONAL ELEMENT سے ہے، جس کا مطلب ہے کہ وہ اشعار جس سے شاعر کے ذاتی حالات یا اکتسابِ فیض کا پتہ چلے۔ یہ اصطلاح انگریزی میں رائج تھی اور علامہ اقبال نے اس کا ترجمہ "شخصی عنصر" وضع فرمایا تھا۔ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۹/ جنوری ۱۹۱۵ء میں لکھتے ہیں :

"شخصی عنصر سے مراد وہ اشعار ہیں جن میں مصنف کے ذاتی حالات واکتسابِ فیض کا اشارہ یا ذکر ہے۔ میں نے یہ لفظ خود ہی وضع کیا تھا۔ اردو زبان میں مروج نہیں ہے۔ انگریزی میں اس مطلب کو اصطلاح PERSONAL ELEMENT سے واضح کرتے ہیں" (۳)

عشقِ رسولِ مقبول ﷺ اور قرآن مجید ہی سے علامہ اقبال کے شخصی عناصر کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بہت سارے اقوال و احوال سے ہوتی ہے جو درجنوں کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی پر ایک مدلل مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے نقوشِ اقبال میں "اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر" کے نام سے پیش کیا۔ اور ایک فکر انگیز تحریر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی بھی "علامہ اقبال اور ہم" کے عنوان سے موجود ہے۔ یہاں پر قرآن مجید کے ضمن میں صرف دو واقعات مولانا سید سلیمان ندوی کی زبانی سنئے۔

سفر کابل کی واپسی میں قندھار کا ریگستانی علاقہ طے ہو چکا تھا اور سندھ و بلوچستان کے پہاڑوں پر ہماری موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ ہم دونوں ایک ہی موٹر میں بیٹھے تھے۔ روحانیت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اربابِ دل کا تذکرہ تھا کہ موصوف نے بڑے تأثر کے ساتھ اپنی زندگی کے دو واقعے بیان کئے۔ میرے خیال میں یہ دونوں واقعے ان کی زندگی کے سارے کارناموں کی اصل بنیاد تھے۔

فرمایا : جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو وہ میرے پاس سے گزرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا : جب امتحان دے لو گے۔ جب امتحان دے چکا اور لاہور سے گھر آیا تو فرمایا : جب پاس ہو جاؤ گے۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتاؤں گا۔ ایک دن صبح حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آ گئے اور فرمایا : بیٹا کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اتر رہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ ان کا یہ فقرہ میرے دل میں اتر گیا اور اس کی لذت دل میں ابتک محسوس کرتا ہوں۔ یہ تھا وہ تخم جو اقبال کے دل میں بویا گیا اور جس کی تناور شاخیں پہنائے عالم میں ان کے موزوں نالوں کی شکل میں پھیلی ہیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے میں جو محنت کی ہے تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ لائق بیٹے نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ باپ نے کہا : کسی موقع پر بتاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔ بات ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ اس کے بعد میں نے لاہور میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا ہوا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا۔ لوگوں نے نظموں کو ذوق و شوق سے پڑھا اور سنا اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا۔ انہی دنوں میرے والد مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ میں ان کو دیکھنے کے لئے لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ والد بزرگوار آپ

سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں۔ باپ نے بستر مرگ پر شہادت دی کہ جان من تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبال نے ساری عمر جو پیغام ہم کو سنایا وہ انہی دو منتوں کی شرح تھی۔ حضورِ انور ﷺ سے علامہ اقبال کے عشق کی تفصیل کے لئے الگ کتاب کی ضرورت ہے' مگر علامہ اقبال کا ایک بچپن کا واقعہ (۴) اس پر روشنی ڈالتا ہے کہ اس محبت کا بیج بھی ان کے والد نے کس طرح ان کے دل میں بویا تھا۔ "روزگارِ فقیر" جلد دوم صفحہ ۱۵۲ پر "گدائے دردمند" کے عنوان سے تحریر ہے :

"مثنوی رموزِ بے خودی میں علامہ اقبال نے اپنے لڑکپن کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک سائل بھیک مانگتا ہوا اور صدا لگاتا ہوا ان کے دروازے پر آیا۔ یہ گدائے مبرم یعنی اڑیل فقیر تھا۔ دروازے سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کے بار بار چیخ چیخ کر صدا لگانے پر علامہ اقبال نے طیش میں آکر اسے مارا اور اس مار پیٹ میں فقیر کی جھول میں جو کچھ تھا وہ زمین پر گر گیا۔ علامہ اقبال کے والد اس حرکت پر بہت آزردہ اور کبیدہ خاطر ہوئے اور دل گرفتہ ہو کر بیٹے سے کہا کہ قیامت کے دن جب خیرالرسل ﷺ کی امت سرکار کے حضور جمع ہوگی تو یہ گدائے دردمند تمہارے اس برتاؤ کے خلاف حضور رسالت مآب سے فریاد کرے گا"۔(۵)

سائلے مثلِ قضائے مبرمے — بر درِ ما زد صدائے پیہمے
از غضب چوبے شکستم بر سرش — حاصلِ دریوزہ افتاد از برش
عقل در آغازِ ایامِ شباب — می نیندیشد صواب و ناصواب
از مزاجِ من پدر آزردہ گشت — لالہ زارِ چہرہ اش افسردہ گشت
برلبش آہے جگر تابے رسید — درمیانِ سینۂ اُو دل تپید
کوکبے در چشمِ او گردید و ریخت — بر سرِ مژگاں بے تابید و ریخت
ہمچو آں مرغے کہ در فصلِ خزاں — لرزد از بادِ سحر در آشیاں
در تنم لرزید جانِ غافلم — رفت لیلائے شکیب از محملم
گفت فردا امتِ خیرالرسل ﷺ — جمع گردد پیش آں مولائے کُل

غازیانِ ملّتِ بیضائے اُو حاملانِ حکمتِ رعنائے او
ہم شہیدانے کہ دیں راجت اند مثلِ انجم در فضائے ملّت اند
زاہدان و عاشقانِ دل فگار عالمان و عاصیانِ شرمسار
درمیانِ انجمن گردد بلند نالہ ہائے ایں گدائے دردمند
اے صراطت مشکل از بے مرکبی من چہ گویم چوں مرا پرسد نبی ﷺ

"حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نشد
یعنی آں انبارِ گل آدم نشد"

در ملامت نرم گفتار آں کریم من رہینِ خجلت و امید و بیم
اند کے اندیش و یاد آر اے پسر اجتماعِ امتِ خیر البشر ﷺ
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

اشعار کا مفہوم : "ایک سائل محکم قضا کی طرح ہمارے دروازے پر صدا لگا رہا تھا۔ میں نے غصہ میں اس کے سر پر لکڑی دے ماری جس سے اس کی دن بھر کی کمائی گر پڑی۔ عقل آغاز شباب میں صواب اور ناصواب کو نہیں دیکھتی۔ میرے اس مزاج سے والد بزرگوار آزردہ ہو گئے اور ان کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ زبان سے آہ جگر تک گئی اور دل کو تڑپا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آئے اور پلکوں سے رواں ہو گئے۔ اس مرغ کی طرح جو فصل خزاں میں صبح صبح ہی آشیانے میں لرزتا ہے' والد صاحب کہنے لگے کہ کل اُس خیرالرسل ﷺ کی امت اللہ کے ہاں جمع ہو گی۔ غازی جو اس ملت کا چمکتا چاند ہیں اور شہید جو کہ ملت کے ستاروں کی طرح ہیں' زاہد بھی ہوں گے' عاشق بھی ہوں گے' عالم اور شرمسار گنہگار بھی ہوں گے۔ اس گروہ میں جب یہ فقیر فریاد کرے گا تو میں حضورِ مقبول ﷺ کو کیا جواب دوں گا جب کہ وہ پوچھیں گے کہ حق تعالیٰ نے یہ نوجوان تمہارے سپرد کیا تھا' تم سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اس مٹی کے انبار کو انسان بنا دیتے۔ اے میرے بیٹے میری سفید داڑھی

پر رحم کھا اور اس باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مجھے رسوا نہ کر۔"(۶)

یہ شاعرانہ بیان یا خیالی حکایت نہیں ہے' بلکہ ایک سچا واقعہ ہے۔ علامہ کے والد کو اپنے بیٹے کی تربیت کا بڑا خیال تھا۔ وہ کسی بات پر ٹوکتے یا اس کے کرنے سے منع فرماتے تو اکثر و بیشتر قرآن حکیم یا اسوۂ رسول ﷺ کے حوالے سے پند و نصیحت فرماتے۔

علامہ اقبال اپنے والد بزرگوار کے اس احسان کو بھی یاد کرتے ہیں۔

از پدر تا نامِ تو آموختم آتش ایں آرزو افروختم(۷)

آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ محبت کا وہ بیج جو بچپن میں بویا گیا تھا اب تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ علامہ اقبال اللہ تعالیٰ سے گزارش کرتے ہیں کہ یہ عالم فنا ہونے والا ہے اور ہر انسان کی کمائی اس کے سامنے لائی جائے گی' مگر ایک احسان مجھ پر یہ فرما دیجئے کہ میرا حساب حضور اکرم ﷺ کی نگاہ سے پنہاں فرما دیجئے۔

حوالہ جات

(۱) مکاتیب اقبال' علامہ اقبال اکیڈمی' ص ۳۸۱

(۲) مکاتیب اقبال' علامہ اقبال اکیڈمی' ص ۳۳۸

(۳) رسالہ "صحیفہ" لاہور' اکتوبر ۱۹۷۳ء' ص ۱۳۷

(۴) اقبال کے پیغام کا متن اور شرح رسالہ "جوہر" کا اقبال نمبر دسمبر ۱۹۳۸ء' ص ۱۹ تا ۲۱

(۵) روزگار فقیر جلد دوم عنوان "گدائے دردمند"' ص ۱۵۲

(۶) رموز بے خودی کلیات اقبال فارسی' ص ۱۳۰

(۷) اسرار و رموز' کلیات اقبال فارسی' ص ۱۶۸

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

منزلِ حیات

اور اس کے قافلہ سالار ﷺ

از سید عبدالعزیز بخاری

۱ ۔ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کدھر جانا ہے؟ یعنی ہماری منزل حیات کیا ہے؟
۲ ۔ اس کائنات کی اور ہماری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟
۳ ۔ ہمیں اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے اور اس دنیوی زندگی کی غرض وغایت کیا ہے؟

یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن پر صدیوں سے غور و فکر ہوتا رہا ہے' حکماء اور فلاسفر اپنی اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے رہے ہیں مگر سوائے ظن و تخمین کے کچھ ہاتھ نہیں آیا' کیونکہ حتمی اور یقینی علم کا ذریعہ تو صرف وحی الٰہی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم ہمیں ان سوالات کے شافی جوابات دیتا ہے' جو قرآن میں تدبر اور تفکر کرنے سے مل جاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو قرآن حکیم ہمیں بتلاتا ہے کہ ہماری پیدائش اور اس ساری کائنات کی پیدائش بے معنی اور بے مقصد نہیں' بلکہ ان کا ایک خاص مقصد ہے۔

آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں :

۱ ۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○
(المومنون : ۱۱۵)

"کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟"

۲ ۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ (الانبیاء : ۱۶)

"ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشے کے لئے پیدا نہیں کیا۔"

۳ - خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○ (العنکبوت : ۴۴)

"اللہ نے آسمانوں اور زمین کو بامقصد پیدا فرمایا ہے۔ یقیناً اس میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں"۔

کائنات کی پیدائش کا مقصد

آیئے سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ اس زمین و آسمان اور کائنات کی پیدائش کا کیا مقصد ہے؟ قرآن حکیم سے ہمیں اس کا یہ جواب ملتا ہے :

۱ - هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ : ۲۹)

"وہ ذات وہ ہے جس نے جو کچھ اس زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا فرمایا۔"

۲ - اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ۔ (البقرہ : ۲۲)

"اس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت۔ پھر آسمان سے پانی برسا کر اس میں تمہارے لئے پھل اور رزق پیدا کئے"

۳ - وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ : ۱۳)

"اور اس نے تمہارے لئے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے مسخر (تابع) کر دیا ہے۔"

ان آیاتِ کریمہ سے واضح ہے کہ باری تعالیٰ نے زمین و آسمان اور ساری کائنات کو انسان کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ پھر انسان کی پیدائش کا کیا مقصد ہے؟

انسان کی پیدائش کا مقصد

اس کا جواب باری تعالیٰ نے یہ دیا ہے :

۱ - وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ (الذاریات : ۵۶)

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے"۔

۲ ۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا
(الملک : ۲)

"اس نے موت و حیات اس لئے پیدا کی تاکہ یہ جانچ سکے کہ تم میں سے کون بہترین عمل پیش کرتا ہے۔"

سبحان اللہ۔ کیا عظمت اور شان ہے انسان کی کہ ساری کائنات کو تو حق تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا فرمایا اور انسان کو خود اپنے لئے۔ اسی لئے وہ اشرف المخلوقات کہلایا۔ ان دو آیات سے عنوان میں دیئے گئے دوسرے سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ ہماری اور اس کائنات کی پیدائش کا کیا مقصد ہے۔

قبل اس کے کہ اس موضوع پر مزید گفتگو کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سوال نمبر ا کا جواب تلاش کیا جائے۔ جب ہم میں سے کوئی اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے تو ہمیں ایک بھولا ہوا سبق یاد دلایا جاتا ہے اور یہ آیتِ کریمہ پڑھی جاتی ہے : "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" (البقرہ : ۱۵۶) یعنی "ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے"۔ یہاں لفظ "رَاجِعُوْن" میں ایک بلیغ نکتہ ہے جس کے معنی ہیں "لوٹ کر جانے والے"۔ ظاہر ہے کہ لوٹ کر انسان وہاں جاتا ہے جہاں سے وہ آیا ہو۔ بس اسی سے ہمیں اپنے پہلے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔ اور ہماری منزلِ حیات خود اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والاصفات ہے۔

ہماری دنیوی زندگی کی غرض و غایت

اب رہ جاتا ہے تیسرا سوال کہ ہمیں اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ یہ تو تقریباً سب کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہم سب عالمِ ارواح میں تھے۔ اور ہماری روحوں کو رب تعالیٰ کی پہچان اور معرفت حاصل تھی جیسا کہ ذیل کی آیت سے واضح ہے کہ اللہ نے "یومِ الست" ہماری روحوں سے سوال کیا تھا : اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؟ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" تو سب ارواح نے مل کر یہ اقرار کیا تھا : قَالُوْا بَلٰى "جی ہاں' باری تعالیٰ

آپ ہی ہمارے رب ہیں" (الاعراف : ۱۸۲)۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہماری روحوں کو اپنے رب کی معرفت پہلے ہی حاصل تھی تو پھر ہمیں وہاں سے اس دنیا میں کس لئے بھیجا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہمیں اپنے رب کی معرفت عالمِ ناسوت میں ہی حاصل تھی مگر اپنے رب کا قرب و حضور ہمیں وہاں حاصل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت اپنے قربِ خاص کو اپنی عبادت اور اعمال صالحہ کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اب چونکہ مجرد ارواح کے لئے عبادت رب اور اعمال صالحہ کا بجالانا ممکن نہ تھا اس لئے ہماری روح کو اس مادی بدن کی سواری عطا کی گئی۔ اس طرح روح اور جسم کے اتصال سے ایک نیا انسان وجود میں آیا جسے اس مادی دنیا میں بھیجا گیا تا کہ وہ ایک مقررہ مدت میں اپنے رب کی عبادت اور اعمال صالحہ بجالا کر اس کا قرب حاصل کر سکے اور درجہ بدرجہ ترقی کر کے اس کی ذات تک رسائی حاصل کر سکے جو اس کا مقصدِ حیات اور منزل مقصود ہے۔ اس کی تائید میں مندرجہ ذیل آیات قرآنی کا مطالعہ کیا جائے :

۱۔ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (الانشقاق : ۶)

"اے انسان بے شک تو نے مشکلات جھیل کر بتدریج اپنے رب کی طرف بڑھنا ہے یہاں تک کہ تو اس سے ملاقات کرے"

۲۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (البروج : ۱۹)

"تم نے سیڑھی پر سیڑھی چڑھنا اور درجہ بدرجہ ارتقائی منازل طے کرنا ہیں"۔

۳۔ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (النازعات : ۴۴)

"تیرے رب کی طرف اس کی انتہا ہے"۔

۴۔ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (النجم : ۱۲)

"بے شک تیرے رب تک سب کی انتہا ہے"۔

چونکہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات لامحدود و لاانتہا ہیں اس لئے اس کے قرب کی منازل بھی لاانتہا ہیں۔ اس لئے ہمارا سفرِ زندگی بھی کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ چلنا' چلنا' مدام چلنا

ع منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟

مقصد کے حصول کا ذریعہ

اوپر مجمل طور پر بتایا گیا ہے کہ مقصد کے حصول کا ذریعہ عبادتِ رب اور اعمال صالحہ ہیں۔ اب یہ بتانا ہے کہ عبادت اور اعمال صالحہ سے کیا مراد ہے؟

عبادت سے مراد

عبادت سے مراد انتہائی تذلّل، عجز و انکساری، کمالِ محبت اور شکر کے جذبات اور تضرع و زاری کے ساتھ اپنے رب کی اطاعت کرنا ہے۔ کبھی کھڑے ہو کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی جھک کر اور کبھی سجدہ ریز ہو کر اپنے رب سے مخاطب ہونا اور اس طرح دعا مانگنا گویا خدا کے حضور کھڑا ہے جو اسے دیکھ رہا ہے اور اس کی دعا سن رہا ہے اور قبول کر رہا ہے، یہ احسان کی پہلی منزل ہے۔ اس کی اوپر کی منزل یہ ہے کہ بندہ خود نماز میں اپنے رب کا دیدار کر رہا ہے اور اس سے التجائیں اور دعائیں مانگ رہا ہے۔ سب سے بڑی دعا تو یہی ہے کہ اے ربِّ کریم! اپنے پاس پہنچنے کا سیدھا راستہ ہمیں بتلا دے اور اس پر مسلسل چلائے رکھ تاکہ انسان کو اپنی منزل مقصود حاصل ہو جائے۔ یہی ہے مطلب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا۔

یاد رہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم وسیع تر ہے۔ اس میں حلال روزی کمانا، اپنے بیوی بچوں کی نگہداشت و پرورش، حقوق العباد کا بجالانا اور کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کرنا وغیرہ بھی شامل ہے، بشرطیکہ ان سب کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔

اعمالِ صالحہ سے مراد

ہر وہ نیک عمل جو خدا و رسول کے حکم کے تحت خالصتاً اس کے قرب اور رضا کے حصول کے لئے بجالایا جائے۔ گویا عمل کے صالح ہونے کی دو شرائط ہیں:

۱۔ ہر عمل اللہ تعالیٰ کے قرب اور رضا کے حصول کی نیت سے کیا جائے۔

۲۔ ایسا ہر عمل رسولِ خدا کی سُنّت کے مطابق اور ان کے اتباع میں ہو، ورنہ وہ عمل صالح نہ ہوگا۔

عبادات اور اعمالِ صالحہ سے مقصود

اس سے انسان کی شخصیت کی تعمیر اور تکمیل ذات یا علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے الفاظ میں تعمیرِ خودی وجود پذیر ہوتی ہے جو درجہ بدرجہ ارتقائی منازل طے کر کے نفس کی تمام آلائشوں سے پاک ہو کر انسان کے باطن کو منور کرتی ہے اور بالآخر اس میں وہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ اپنے رب کا دیدار کر سکے۔ واضح رہے کہ جنت اس کے مقامِ قرب و رضا کا ہی دوسرا نام ہے۔ سب سے پہلے نفس امارہ کے ساتھ مسلسل جہاد کر کے اسے نفسِ لوامہ میں تبدیل کرنے اور پھر اس کا مزید تزکیہ کر کے نفس مطمئنۃ کی بلند منزل تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اس کی شخصیت یا خودی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور پھر یہ آواز آتی ہے :

﴿ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِىۡ فِىۡ عِبٰدِىۡ ○ وَادْخُلِىۡ جَنَّتِىۡ ○ ﴾

(الفجر : ۲۸)

"اے نفسِ مطمئنۃ' اپنے رب کی طرف لوٹ آ' در آنحالیکہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پس شامل ہو جا میرے خاص بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں"۔

گویا یہ عبادات اور اعمال صالحہ جو کچھ بھی انسان بجالاتا ہے' اس سے اس کی اپنی شخصیت اور ذات کی تکمیل ہوتی ہے' اس میں اس کا اپنا ہی فائدہ مضمر ہے۔ اگر وہ خدا کی نافرمانی اور گناہ کرتا ہے تو درحقیقت اپنی ہی شخصیت کو بگاڑتا اور مسخ کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرتا ہے (رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا) اللہ تعالیٰ کی ذات تو اس سے بے نیاز اور وراء الوراء ہے کہ ہماری عبادتوں کا اسے کچھ فائدہ پہنچے یا ہمارے گناہوں سے کچھ نقصان (نعوذ باللہ)

"صراطِ مستقیم" سے مراد

"صراطِ مستقیم" کی تعریف قرآن کریم نے یہ کی ہے کہ یہ انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین کی راہ ہے۔ گویا یہ کوئی تنگ پگڈنڈی نہیں بلکہ ایک وسیع شاہراہ ہے جس پر مذکورہ

بالا تمام بندگانِ خدا کے نقش پا ثبت ہیں۔ پھر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو قرآن کی قسم کھا کر باری تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ یقیناً صراطِ مستقیم پر ہیں (سورۂ یٰسین)۔ گویا صراطِ مستقیم پانے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ پا کی تلاش ضروری ہے۔ اسی طرح تعمیر شخصیت اور تکمیل ذات کے لئے بھی کسی کامل نمونہ 'ماڈل یا آئیڈیل کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ماڈل' یہ کامل نمونہ بھی اللہ تعالیٰ نے حضور سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ اقدس کو بنایا ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

(الاحزاب : ۲۱)

"(اے مسلمانو) بے شک تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کامل نمونہ اور بہترین ماڈل ہے"۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کا طریق

ایمان باللہ کی لازمی شرط اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہے۔ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ (البقرہ : ۱۶۵) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تو ہمارے تصور اور وہم و خیال سے بھی کہیں برتر اور وراء الوراء ہے' پھر اس سے کیسے محبت کی جائے؟۔

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من

(عارف رومی)

اس مشکل کا حل بھی اُس رحیم و کریم خدا نے اپنے رسول کی زبانی یہ بتلایا ہے :

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾

(آل عمران : ۳۱)

"(اے رسول") کہہ دیجئے اگر آپ لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہیں تو پھر میری اتباع کرو (جب تم ایسا کرو گے) تو اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے"۔

سبحان اللہ' ڈھونڈنے گئے تھے اللہ تعالیٰ سے محبت کا طریق' بن گئے خدا کے محبوب۔ یہ شان ہے اتباعِ رسول کی۔

خدا اندر قیاسِ ما نہ گنجد　　شناس اُو را کہ گوید "ما عرفناک"!

(اقبال)

"خدا تو ہمارے عقل و قیاس میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے تو اسے پہچان جس نے کہا ہے :

"ماعرفناکَ"

اس شعر میں علامہ اقبال نے حدیثِ نبویؐ کے ان الفاظ کی طرف اشارہ کیا ہے :

"مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ"

"یااللہ ہم تیری معرفت کا حق ادا نہیں کر سکے"۔ (الحدیث)

پس اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبتِ رسول ﷺ ہی محبتِ حق تعالیٰ ہے۔

نیز اطاعتِ رسول ﷺ اطاعتِ حق تعالیٰ ہے۔

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ (النساء : ۸۰)

اور نطقِ رسول ﷺ نطقِ حق تعالیٰ ہے :

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ○ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ○﴾

قافلہ سالارِ منزلِ حیات ﷺ

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہمارے لئے کامل نمونہ ہے۔ ظاہر ہے کہ منزل حیات کے حصول کے لئے کسی ایسی شخصیت کا نمونہ ہی کامل ہو سکتا ہے جسے نہ صرف خود منزل کا پتہ ہو بلکہ وہ خود منزل سے ہو کر مخلوق خدا کی ہدایت کے لئے واپس آیا ہو۔ اور کہہ رہا ہو لوگو میرے پیچھے پیچھے آؤ (فَاتَّبِعُوْنِیْ) میرے قدم بقدم چلو تا کہ میں تمہیں منزل پر پہنچا دوں۔

اس ساری کائناتِ ارضی و سماوی میں بشمول حضرات انبیاء، مرسلین اور ملائکہ مقربین، کامل ترین واحد ہستی صرف افضل الانبیاء والمرسلین ﷺ کی ذاتِ والاصفات ہے جنہوں نے "قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی" کی قربت کی منزل پائی اور "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" کا سرٹیفکیٹِ استقامت بھی ذات باری تعالیٰ سے حاصل کیا۔

اسی لئے اس طویل سفرِ حیات میں منزل عشق کے قافلہ سالار صرف اور صرف حضور

والاصفات کی ذات بابرکات ہے' جو تمام جن وانس' ملائکہ مقربین' اولیاء' اتقیاء' صلحاء' صدیقین' شہداء اور سابقہ تمام انبیاء و مرسلین کے پیش رو اور رہنما ہیں۔ ان سب کو حضور افضل الانبیاء والمرسلین کے نقش قدم پر چلنے کے سوا کوئی مفر نہیں۔ خود حضورؐ نے بروایت حضرت علیؓ و حضرت ابن عباسؓ یہ ارشاد فرمایا کہ "اگر آج موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو آپ کو میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا"۔ اور "عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہونگے تو قرآن کریم اور تمہارے نبی کی سنت پر فیصلے کریں گے"۔ اسی لئے بروزِ میثاق حق تعالیٰ نے تمام سابقہ انبیاء سے حضور خاتم النبیین والمرسلین ﷺ پر ایمان لانے اور اپنی نصرت بہم پہنچانے کا وعدہ لیا تھا (آل عمران : رکوع ۸)۔ بقول مولانا جامی۔

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

بقول علامہ اقبال :

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بُو

اتباعِ رسول سے مراد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ عبادات میں' معاملات میں' معاملات میں' اخلاقیات میں' عادات میں' صفات میں یہاں تک کہ حرکات و سکنات میں بھی حضورؐ کی پیروی کی جائے۔ گھریلو زندگی ہو کہ مدنی' شخصی زندگی ہو کہ مجلسی' خلوت ہو کہ جلوت' تعلیم و تعلم ہو کہ جہاد' صلح ہو کہ جنگ' سیاست ہو کہ حکومت---- غرض زندگی کے ہر ہر شعبہ میں حضور ﷺ کی متابعت لازمی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا چلنا پھرنا' اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا اور سونا وغیرہ سب کچھ حضورؐ کے قول و فعل کے مطابق ہو۔ اور یہ اتباع حقیقی جذبۂ محبت' ذوق و شوق' گہرے قلبی لگاؤ اور شیفتگی کے ساتھ ہو نہ کہ کسی لگی بندھی مجبوری کے تحت۔ جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۶۵ میں فرمایا کہ "آپ کے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوں گے جب تک یہ اپنے

تنازعات میں آپ کو اپنا حکم نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ آپ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ خوش دلی کے ساتھ اسے قبول کریں"۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر احسان ہے کہ جس طرح اس نے اپنے آخری کلام قرآن کریم کو ہمارے لئے محفوظ فرمایا اسی طرح ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنے آخری رسول ﷺ کی سنّت کی حفاظت کا بھی مہتم بالشان انتظام فرمایا۔

اتباعِ رسول کی چند قابل قدر مثالیں

۱۔ حضرت اویس قرنی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کو جب جنگِ احد میں حضور اکرم ﷺ کے دو دندان مبارک شہید ہونے کی اطلاع ملی تو انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے سارے دانت نکال دیئے اس خیال سے کہ نہ معلوم حضور ﷺ کے کون سے دندان مبارک شہید ہوئے ہیں؟

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمیشہ اس درخت کی ٹہنی سے جھک کر گزرتے رہے جس کی درخت کے نیچے سے حضور ﷺ ان کی معیت میں ایک دفعہ کسی وجہ سے جھک کر گزرے تھے۔

۳۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے ساری عمر صرف اس لئے خربوزہ نہ کھایا کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضورؐ نے کبھی خربوزہ کھایا تھا یا نہیں اور اگر کھایا تھا تو کیا چھری سے کاٹ کر کھایا تھا یا کیسے؟

انتباہ : یاد رہے کہ اس سفرِ حیات میں اگر ایک قدم بھی حضور ﷺ کے نقشِ قدم سے اِدھر اُدھر پڑ گیا تو سمجھ لو کہ منزل سے بھٹک گئے ہیں۔ جتنے قدم غلط پڑیں گے اسی قدر منزل سے دوری ہوتی جائے گی۔ ؏

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد!

(ایک لحظہ کی غفلت سے سو سالہ راہ دور پڑ گئی)

یہ نمازیں' یہ روزے' یہ حج' یہ زکوٰۃ' یہ صدقات' یہ جہاد' اگر حضور اکرم ﷺ کے طریق اور سنت سے ہٹ کر ہیں تو پھر کچھ بھی نہیں' سب بے کار ہیں۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب!

فریضۂ رسالت اور اتباعِ رسولؐ کا عظیم تقاضا

سیرت پاک کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ حضورؐ نے اپنی بعثت کے دن سے لے کر آخر دم تک جو کام مسلسل کیا ہے وہ ہے دعوت و تبلیغ دین' باطل کے خلاف جہاد اور اعلائے کلمۃ الحق۔ لہٰذا اتباعِ رسول کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسی طرح دعوت و تبلیغ' باطل کے خلاف جہاد اور دین حق کی سربلندی اور اس کے عملی نفاذ کے لئے جدوجہد کریں۔

کامل اتباع حبِ رسولؐ کے بغیر ممکن ہی نہیں

اس قسم کی کامل اتباع' متبوع کے ساتھ شدید محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے مومنین کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ ﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (الاحزاب : ٦) یعنی "نبی ﷺ مومنین کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں"۔ اس کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن میں حضورؐ کی محبت اور کمال آداب کی مومنوں کو تلقین کی گئی ہے۔ خود حضور اکرم ﷺ نے قسم اٹھا کر ایک حدیث میں فرمایا ہے :

"وَالذی نفسی بیدہٖ لایؤمن احدُکم حتیٰ اکون احبَّ الیہ مِن والدہٖ ووَلدِہٖ وَالنّاس اجمعین"

"قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے اپنے والدین' اولاد اور تمام جہان کے لوگوں سے زیادہ محبت نہیں کرتا"۔

مذکورہ بالا آیت و حدیث مبارک سے یہ واضح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے محض محبت نہیں بلکہ اپنی جان و مال' ماں باپ' اولاد اور سب جہان والوں سے زیادہ محبت واجب

ہے 'جس کے بغیر ایمان ہی مفقود ہے۔ گویا محبت اور اتباع لازم وملزوم ہیں۔

حُبِّ رسول ﷺ کے تقاضے

۱۔ کامل اطاعت واتباع رسول ﷺ
۲۔ نصرت وحمایتِ رسول ﷺ
۳۔ کمال آدب وتوقیر وتعظیم رسول

نمبر ۱ کی وضاحت اوپر بیان ہو چکی ہے 'اب نمبر ۲ اور نمبر ۳ کی وضاحت کی جائے گی۔

○ نصرت وحمایتِ رسولؐ

حضور خاتم النبیین والمرسلین ﷺ کے بعد چونکہ قیامت تک کسی نبی اور رسول نے نہیں آنا تھا اس لئے حضورؐ کے فریضۂ رسالت یعنی مخلوقِ خدا کو شرک وبت پرستی سے نکالنا' انسان کو انسان کی چیرہ دستیوں اور ظلم وستم سے نجات دلا کر آزادی کی نعمت عطا کرنا' اسے جہالت اور کفر کے اندھیروں سے نکال کر توحید کے نور سے منور کرنا' باطل کے خلاف مسلسل جہاد اور اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ اس طرح ادا کرنا کہ باطل سرنگوں ہو جائے اور حق کا بول بالا ہو جائے' گمراہ اور بھٹکی ہوئی مخلوقِ خدا کو صراط مستقیم پر گامزن کر کے اسے منزل حیات سے روشناس کرنا' یہ سارے کام جس قدر کٹھن' جاں گسل اور صبر آزما تھے اسی قدر اہم بھی۔ نبی آخر زمان ﷺ کی بعثت مخلوق خدا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری اتمامِ حجت بھی تھی' اس لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا اور اس کی مشیت یہی تھی کہ نبی کریم ﷺ کا مشن کامیابی سے ہمکنار ہو تا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مخلوق عذابِ الٰہی سے بچ کر فلاح دارین حاصل کر سکے۔ لہٰذا اس نے اپنے اس اولوالعزم آخری نبی کی مدد اور نصرت وحمایت کا مندرجہ ذیل مہتم بالشان انتظام فرمایا :

۱۔ **میثاق انبیاءِ سابقین** : تمام انبیائے سابقین سے پورے اہتمام کے ساتھ یہ عہد اور قول واقرار لیا گیا کہ وہ نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں گے اور ان کی مدد ونصرت کریں

گے۔

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ○﴾

(آل عمران : ۸۱، ۸۲)

"اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے یہ عہد لیا تھا کہ آج ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا کی ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اس کے بعد اللہ نے نبیوں سے پوچھا، کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے"۔

۲۔ **میثاق بنی اسرائیل** : مندرجہ بالا عہد و اقرار ان انبیاء کی امتوں پر بھی آپ سے آپ لاگو ہوتا تھا، اور انبیاء اپنی اپنی امتوں کو سب سے آخر میں آنے والے نبی پر ایمان لانے اور اس کی مدد و نصرت کرنے کی تلقین اور تاکید بھی کرتے رہے۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے تاکید مزید کے طور پر بنی اسرائیل اور یہود و نصاریٰ سے بھی نبی امی ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی تائید و نصرت کا عہد لیا : ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ بَنِىٓ اِسْرَائِيلَ﴾ (المائدہ) پھر سورۂ اعراف میں نبی اُمّی ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی اتباع کی ہدایت کے بعد فرمایا :

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾

"پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی توقیر کی اور مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو

اس پر اتار اگیا تو وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

۳ ۔ **ذاتِ خداوندی کی مدد و نصرت** : حضور ﷺ کی بعثت کے بعد مختلف مواقع پر اللہ تعالیٰ نے خود اپنی نصرت و حمایت سے آپ کو نوازا اور سکینہ کا نزول فرمایا۔

۴ ۔ **فرشتوں کی مدد و نصرت** : جنگِ بدر جو حضورؐ کے مشن اور تحریک اسلامی کی کامیابی کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے' اس میں ہزاروں کی تعداد میں فرشتے بھیج کر نصرت و اعانت فرمائی گئی ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ اسی طرح دوسرے غزوات میں بھی غیبی امداد فرمائی گئی۔

۵ ۔ **صحابہؓ کی مدد و نصرت** : آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے بے مثل ساتھی یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عطا کئے گئے جو اپنا تن من دھن سب کچھ حضورؐ پر قربان کرنے کو تیار تھے اور انہوں نے تاحیات حضورؐ کے فریضۂ رسالت کی ادائیگی اور مشن کی کامیابی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔

۶ ۔ **امّتِ مسلمہ کی مدد و نصرت** : سب سے آخر میں حضورؐ کے رحلت فرمانے کے بعد امتِ مسلمہ پر یہ فریضہ عائد کیا گیا کہ وہ حضورؐ کے مشن کو آگے بڑھائے اور فریضۂ رسالت کی تکمیل کے لئے اپنا تن من دھن صرف کرکے ساری دنیا میں حق کا بول بالا کرے اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام عمل میں لائے اور اس طرح شہادت علی الناس کا فرض ادا کرے۔

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی!

محاسبہ : ہم سب کو انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر اپنا اپنا محاسبہ کرنا چاہئے کہ ہم اتباعِ رسولؐ اور نصرتِ رسولؐ کا فریضہ کس حد تک ادا کر رہے ہیں۔ اگر ادا نہیں کر رہے تو پھر محبت و عشقِ رسولؐ کا دعویٰ جھوٹ اور فریب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

○ کمالِ ادب و توقیر و تعظیمِ رسالت

یہ وہ موضوع ہے جہاں فکرِ انسانی کی پرواز عجز و بے بسی کا اظہار کرنے پر مجبور ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل بھی آگے بڑھنے کی تاب نہیں لا سکتی جس طرح شب معراج حضرت جبریل سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر رک گئے تھے اور اپنے عجز کا اظہار بزبان شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ اس طرح کیا تھا۔

"اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم"

"اگر میں ایک سرِ مو بھی آگے پرواز کروں تو میرے پر اللہ تعالیٰ کے نور کی تجلّی سے جل جائیں گے"۔

یہ وہ منزل ہے جہاں روح القدس، ملائکہ مقربین، انبیاء و رسلؑ، صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظام بھی دم نہیں مار سکتے :

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!!

"اس آسمان کے نیچے ایک ایسی ادب گاہ ہے جو عرشِ الٰہی سے بھی زیادہ نازک ہے (بزرگ تر نہیں) اس بارگاہِ قدس میں حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے اولیاءِ کبار اپنا سانس کھینچ کر آہستہ داخل ہوتے ہیں کہ اونچی سانس بھی سوءِ ادب کا باعث نہ بنے"۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ بارگاہ رب العزت میں حضور پاک ﷺ کی توقیر و تعظیم کا کیا مقام ہے!

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں تمام انبیاء کو ان کے نام سے پکارا ہے جیسے یا آدم، یا ابراہیم، یا موسیٰ، یا عیسیٰ وغیرہم مگر حضور اکرم ﷺ کو کہیں بھی "یا محمد" کہہ کر نہیں مخاطب کیا گیا بلکہ منصبِ رسالت کے حوالے سے یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ، یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ کہہ کر پکارا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں حضورؐ کی عزت و توقیر کی ایک علامت ہے۔

۲۔ جب یہود و منافقین نے حضورؐ کو مخاطب کرتے ہوئے "رَاعِنَا" کو شرارت سے

بگاڑ کر "رَاعِینَا" کہنا شروع کیا تو باری تعالیٰ کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ حضورؐ کی اس طرح نامعلوم طریق پر اہانت کی جائے۔ اس لئے فوراً مومنین کو ہدایت فرمائی کہ لفظ "رَاعِنَا" کو بدل کر اس کی بجائے "اُنْظُرْنَا" کہا کرو اور پھر ادب سے حضورؐ کی بات سنا کرو۔ (البقرہ : ۱۰۴)

۳۔ جب کبھی صحابہ کرامؓ حضورؐ کی دعوت پر حجرۂ مبارک میں کھانے کے لئے جاتے تو کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی کھانے کے بعد وہاں بیٹھنے سے منع کر دیا کہ اس طرح اس کے رسول کو دل میں تکلیف محسوس ہوتی ہے مگر وہ حیا کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پاتے۔

۴۔ مگر سب سے بڑھ کر حضورؐ کے کمالِ ادب و احترام کے سلسلہ میں دو آیات ایسی ہیں جن کی تلاوت اور غور و تدبر کرنے پر مجھ جیسے کم علم، کم فہم اور کم ترین خلائق، بندۂ عاصی کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مترجمین اور مفسرین حضرات عام طور پر ان پر سے سرسری گزر جاتے ہیں اور ان کی گہرائی میں غوطہ زن نہیں ہوتے۔

ان میں سے ایک آیت تو میثاقِ انبیاء والی آیت ہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس آیۂ کریمہ کے تیور ہی بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ انبیاء کرام جن سے عہد لیا گیا اور جس انداز سے لیا گیا اور وہ نبی آخر الزمان جس کے لئے یہ عہد لیا گیا ہے---ان کے مراتب میں کیا فرق ہے؟۔ اور آخر میں عہد شکنی کی صورت میں یہ دھمکی ﴿ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ ﴾ سے تو اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی اور خوف سے انسان لرز اٹھتا ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اس دھمکی کا اطلاق ان انبیاء کی امتوں پر کیا ہے۔ یہ بجا سہی مگر بہرحال اصل خطاب تو انبیاء سے ہی کیا گیا ہے۔

دوسری آیت جو صراحۃً نبیِّ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم و تکریم اور کمال ادب و احترام کے سلسلہ میں ہی نازل ہوئی ہے، یہ ہے :

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (الحجرات : ۳۰)

"اے ایمان والو امت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ان سے گفتگو میں آواز کو اس طرح بلند کیا کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کرتے ہو' مبادا تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور تک نہ ہو پائے"۔

اس آیۂ کریمہ کی تلاوت سے میرے ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے اور میرا دل جو گہرا اثر قبول کرتا ہے' میں اپنے قارئین کرام کو بھی اس میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ اندازہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و احترام کا یہ مقام ہے کہ آپؐ کے حضور محض اونچی آواز سے بولنا بھی اس قدر خلافِ ادب' ناپسندیدہ اور ناگوار ہے کہ ایسا کرنے والوں کو حبطِ اعمال یعنی بربادیٔ اعمال کی سخت ترین الفاظ میں دھمکی دی گئی ہے۔

کن کے اعمال؟ اب ذرا خیال فرمائیں یہ کن کے اعمالِ حسنہ تھے؟ یہ ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اعمال حسنہ تھے کہ جنہوں نے اپنا تن' من' دھن بلکہ ساری زندگی حضورؐ کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ جو انبیاء و رُسل کے بعد بہترین خلائق تھے۔ وہ جن کی مثال چشم فلک نے نہ پہلے کبھی دیکھی تھی نہ بعد میں۔ وہ ہستیاں جن کے ذکرِ خیر کا غلغلہ ان کی پیدائش سے بھی سینکڑوں ہزاروں برس پہلے تورات و انجیل میں پایا جاتا ہے۔ وہ قدسی الصفات انسان جن کی پیشانیاں کثرتِ سجود کے نور سے چمک رہی تھیں اور وہ حضرات جن کی شان میں "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کے الفاظ آئے ہیں۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!!

کونسے اعمال؟ ان اعمال میں لازماً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حضورؐ کے ساتھ غارِ ثور میں رفاقت کی وہ تین راتیں بھی شامل ہونگی جن کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ کی تمام زندگی کی نیکیاں جو فرمان رسول کے مطابق آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ تھیں' ہیچ تھیں اور حضرت عمرؓ یہ تمنا کرتے تھے کہ کاش میری عمر بھر کی نیکیوں کے عوض مجھے حضرت

ابو بکر صدیق کی ان تین راتوں کی نیکیاں مل جاتیں۔ ان اعمال حسنہ میں جنگِ بدر اور جنگِ احد کا وہ جہاد فی سبیل اللہ' وہ بے مثل جانی و مالی قربانیاں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ جاں نثاریاں بھی شامل ہو نگی جن کا مقابلہ اولین و آخرین کی تمام نیکیاں بھی نہیں کر سکتیں۔ ان اعمال میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جنگ خندق میں وہ ضربتِ حیدری بھی شامل ہو گی جس نے عمرو عبدِوُدّ جیسے عرب کے مشہور بہادر جنگجو کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے اور جس پر ایک روایت کے مطابق حضور رسالت مآب ؐ کی زبان فیض ترجمان نے فرمایا تھا کہ علی کی تلوار کی آج کی ایک ضرب ثقلین کی عبادت سے بہتر ہے۔ ان میں حضرت علیؓ کا قلعۂ خیبر کے ایک بہت بڑے دروازے کا ایک ہاتھ سے اکھاڑ کر مرحب جیسے کافر جری پہلوان' جو ایک ہزار کے برابر سمجھا جاتا تھا' کا قتل بھی شامل ہو گا جس پر حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی کو اللہ و رسول کے محبّ اور محبوب ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا تھا۔

ان اعمال حسنہ میں یقیناً جنگِ تبوک کے موقع پر عام صحابہ کرامؓ کا وہ بے مثل ایثار بھی شامل ہو گا جس میں ہر ایک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور حضرت عمرؓ نے تو کمال ہی کر دیا تھا کہ اپنی ساری جائداد اور اثاثوں کو برابر دو حصوں میں تقسیم کر کے نصف اپنے بیوی بچوں کے لئے چھوڑ کر بقیہ نصف راہِ خدا میں دے دیا اور اپنے دل میں یہ خیال کر رہے تھے کہ وہ آج "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" کے ضمن میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بازی لے جائیں گے۔ مگر ٹھہریئے۔ ذرا تاریخ کے اوراق الٹئے اور چشم تصور وا کیجئے۔ وہ دیکھیں' دور سے ایک بوڑھا شخص بڑی متانت مگر انتہائی تواضع اور انکسار کے ساتھ قدم بڑھائے چلا آ رہا ہے۔ یہ کون ہے جو اپنے بدن پر ببول کے کانٹوں سے ٹانکا ہوا ٹاٹ کا لباس پہنے آ رہا ہے اور گھر کا سارے کا سارا اثاثہ اپنے ساتھ لا رہا ہے؟ جی ہاں یہ وہی حضور اکرم ﷺ کا رفیق اور یارِ غار ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں "اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" کے لازوال الفاظ نازل ہوئے ہیں..... یہ دیکھ کر نبیِّ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم فرطِ محبت سے یوں گویا ہوئے "ابو بکر گھر کے لئے کیا چھوڑ آئے ہو؟ تو جواب ملا "اللّٰه ورسوله" سبحان اللہ۔ ایثار کی تو حد ہی کر دی' ہے کوئی مثال اولین و آخرین میں اسکی؟

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی،
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

اللہ تعالیٰ کو یہ ادا اتنی پسند آئی کہ زمین سے لے کر آسمان تک سب فرشتے ٹاٹ کا پیوند لگا لباس پہنے نظر آئے۔

چونکہ "حبطِ اعمال" کی دھمکی میں قرآن نے کوئی تخصیص نہیں کی ہے اس لئے یہ بے مثل ایثار اور قربانی بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دی جاسکتی۔

الغرض ان سب مثالوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان عظیم الشان انسانوں کے عظیم الشان کارنامے بھی اپنے محبوب نبیِ رحمت ﷺ کے ادب و احترام کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ اس سے ایک طرف تو ربّ العزت کی بارگاہ میں حضورؐ کی کمال تعظیم و تکریم کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف اس کی شان بے نیازی کا۔

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است!

(اپنا منہ مشک و گلاب سے ہزار بار بھی دھوؤں، پھر بھی آپ کا نام نامی زبان پر لانا انتہائی بے ادبی ہے)

محبّتِ رسولؐ کے کچھ اور تقاضے

مندرجہ بالا تقاضوں کے علاوہ محبتِ رسول کے کچھ ایسے تقاضے بھی ہیں جو قانونی فقہی تقاضوں سے برتر ہیں، جنہیں الفاظ بیان کرنے سے قاصر ہیں، جہاں قلم ٹوٹ جاتا ہے اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ انہیں صرف عُشّاق اپنے سوختہ دلوں کی تپش اور بے تاب روح کی تڑپ سے محسوس کرسکتے ہیں یا کسی قدر آنسوؤں کی زبان اس کا اظہار کرسکتی ہے۔

جب عشق و محبت اور اتباعِ محبوب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو محبوب کی اداؤں، محبوب کی صورت و سیرت اور صفاتِ محمودہ کا عکس مُحِبّ پر پڑتا ہے اور ان کے اثرات محب میں اس طرح منتقل ہو جاتے ہیں جیسے لوہا آگ میں ڈالنے سے آگ کی صفات اپنا لیتا ہے۔ اسے تصوف کی اصطلاح میں "فنافی الرسول" کہتے ہیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ کے

مشہور بزرگ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے چہرے کی تاب نہ لائی جاسکتی تھی' اس لئے وہ چہرے پر نقاب ڈال کر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ جمعہ کی نماز میں اتفاقاً انکے چہرے سے نقاب الٹ گیا۔ خطیب کی جو نظر ان پر پڑی تو بے ہوش کر ممبر سے نیچے گر گیا۔ یہ ہے اتباع کا کمال۔ جس محبوب کے عشاق کا یہ حال ہو تو پھر وہ محبوب خود کس قدر حسن و خوبی کا مالک ہو گا؟

عاشقانِ اُو زِ خوباں خوب تر
خوشتر و زیبا تر و محبوب تر

"نبی کریم ﷺ کے عاشق دوسرے محبوبوں سے کہیں زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ زیادہ خوب رو' زیادہ دلکش اور زیادہ پیارے ہوتے ہیں"۔

بہرحال حضور کے حسنِ صورت' حسنِ سیرت اور دیگر محمودہ صفات کا تعلق بھی اگرچہ محبتِ رسول سے پایا جاتا ہے مگر یہ ایک طویل مستقل موضوع ہے اور موجودہ مضمون کی تنگ دامانی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ صرف حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ میں اتنا عرض کئے دیتا ہوں۔

حسنِ یوسف' دمِ عیسیٰ' یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!!

خلاصہ : اب آیئے ان سارے مباحث کا خلاصہ نکال کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں :

i) ہماری منزلِ حیات حقیقتِ مطلقہ تک رسائی اور اللہ تعالیٰ کا قرب و حضور حاصل کرنا ہے۔

ii) اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ایمان و اعمالِ صالحہ ہیں۔

iii) عملِ صالح صرف وہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں ہو۔

iv) نبی پاک ﷺ کی کامل اتباع حضورؐ کے ساتھ شدید قلبی لگاؤ اور عشق و محبت کے بغیر ممکن نہیں۔

نتیجہ : پس نتیجہ یہ نکلا کہ سارے دین کی بنیاد نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شدید محبت پر قائم ہے' جس کا ایک عظیم تقاضا یہ ہے کہ حضور کا کمال ادب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت اور مشن کی تکمیل یعنی تمام دنیا میں اعلائے کلمۃ الحق اور دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنے کی جدّوجہد میں اپنے تن 'من' دھن کی بازی لگا دی جائے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ :

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

(اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لے جا' کیونکہ سارے کا سارا دین آپ کی ذاتِ اقدس ہی ہے۔ اگر تو وہاں نہ پہنچا تو پھر تمام تر علم و فضل' دینداری اور تقدس کے دعویٰ کے باوجود تو ترا بے دین اور کافر ابولہب کی طرح ہو گا"۔

حفیظ جالندھری مرحوم نے اپنے دلکش انداز میں حضور ﷺ کی محبت کے بارے میں قرآن و حدیث کی عمدہ ترجمانی کی ہے!

محمد ﷺ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے
محمد ﷺ ہے متاعِ عالمِ ایجاد سے پیارا
پدر' مادر' برادر' مال و جاں' اولاد سے پیارا!!

یَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

پوسٹ کوڈ نمبر ارسال کیجئے!

اگر آپ کو حکمت قرآن بذریعہ ڈاک موصول ہوتا ہے تو ازراہ کرم آپ ہمیں اپنا پوسٹ کوڈ نمبر جلد از جلد ارسال کر دیجئے۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کی ہدایت کے مطابق آپ کے ایڈریس کے ساتھ پوسٹ کوڈ نمبر کا ہونا ضروری ہے۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن K-36 ماڈل ٹاؤن' لاہور
پوسٹ کوڈ نمبر 54700

سلام کی اہمیت اور غیر مسلم کو سلام کا حکم

سید جلال الدین عمری

(دوسری قسط)

غیر مسلم کو سلام کرنے کا ثبوت

روایت ہے کہ حضرت ابو امامہؓ کا راستہ چلتے ہوئے مسلمان، نصرانی، چھوٹے یا بڑے جس کسی کے پاس سے بھی گزر ہوتا سلام کرتے۔ جب ان سے اس سلسلہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ ہمیں سلام کے عام کرنے اور پھیلانے کا حکم ہے۔[۱۶]

بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت ابو اسامہؓ نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے لئے برکت کی دعا اور ذمیوں کے لئے امن و امان کا اظہار ہے۔[۱۷]

امام ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ سلف سے مروی ہے کہ وہ اہل کتاب کو سلام کیا کرتے تھے۔[۱۸]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابو درداءؓ اور فضالہ بن عبیدؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ اہلِ کتاب کو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔[۱۹]

عون بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا کہ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے دریافت کیا کہ ذِمیوں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کی جاسکتی ہے؟ انہوں

۱۵۔ معاہدہ کی تفصیل کے لئے دیکھی جائے۔ ابن ہشام : سیرۃ النبیؐ ۱۱۹/۲۔۱۲۳

۱۶۔ قال الحافظ اخرجہ الطبری بسند جید۔ فتح الباری : ۴۱/۱۱۔

۱۷۔ ابن حجر، فتح الباری : ۳۹/۱۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن : ۱۱۲/۱۱

۱۸۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن : ۱۱۲/۱۱

۱۹۔ عینی، عمدۃ القاری : ۱۹/۱۲

نے جواب دیا کہ ہماری طرف سے سلام کی ابتدا صحیح نہیں ہے' البتہ ان کے سلام کا جواب دیا جائے گا۔ عون بن عبداللہ نے اس مسئلہ میں خود محمد بن کعب قرظی کی رائے دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ انہیں آگے بڑھ کر سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۲۰]

امام اوزاعی سے سوال کیا گیا کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلم کے پاس سے گزرتے وقت اسے سلام کر سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا اگر تم نے سلام کیا تو اس سے پہلے صالحین نے سلام کیا ہے اور اگر تم نے سلام نہیں کیا تو صالحین نے سلام نہیں بھی کیا ہے۔ (یعنی سلف سے دونوں طرح کے عمل منقول ہیں۔[۲۱])

سماجی تقاضوں کے تحت غیر مسلم کو سلام کا جواز

ایک خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تو سلام کو ہر موقع اور ملاقات پر عام کرنے کا حکم ہے' غیر مسلموں کے بارے میں اس طرح کی ہدایت نہیں ہے' البتہ سماجی ضروریات اس کا تقاضا کر رہی ہوں تو انہیں سلام کیا جا سکتا ہے۔

حضرت علقمہؒ کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ کچھ دہقان (ذمی) بھی شریک سفر تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کا راستہ الگ ہو گیا اور وہ اس پر چلنے لگے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے انہیں سلام کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ذمیوں کو سلام کرنا کیا ناپسندیدہ نہیں ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا کہ یہ تو حقِ صحبت ہے۔[۲۲]

۲۰۔ ابن حجر' فتح الباری : ۳۹/۱۱

۲۱۔ قرطبی' الجامع لاحکام القرآن : ۱۱/ ۱۱۲۔ نووی' شرح مسلم ج ۵ جزء ۱۴ ص ۱۴۵۔

۲۲۔ قال الحافظ اخرجه الطبری بسند صحیح' فتح الباری ۴۱/۱۱۔ قرطبی' الجامع لاحکام القرآن : ۱۱۲/۱۱۔ مصنف عبدالرزاق کی روایت میں علقمہ کے سوال اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے جواب کا ذکر نہیں ہے۔ ۱۲/۶ امام محمد کی روایت ہے کہ ایک ذمی نے جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے ساتھ تھا' جدا ہوتے وقت سلام کیا تھا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا تھا۔ کتاب الاثار ص ۱۲۸۔ (مطبع اسلامی لاہور ۱۹۱۱ء) علامہ ابوبکر جصاص حضرت علقمہ کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں : ظاهره يدل على ان عبدالله بدأهم بالسلام لان الرد لا يكره عند احد' احکام القرآن : ۵۲۵/۳۔ یعنی بظاہر عبداللہ بن مسعودؓ نے ان لوگوں کو سلام کیا تھا' اس لئے کہ جہاں تک سلام کے جواب کا تعلق ہے وہ کسی کے نزدیک بھی ناپسندیدہ نہیں۔

بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کا اپنی کسی حاجت اور ضرورت کے تحت غیر مسلم کو سلام کرنا جائز ہے۔ قاضی عیاض کے بقول یہ حضرت علقمہ اور امام نخعی کا قول ہے [۲۳]

سلیمان الاعمش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم نخعی سے کہا کہ ایک نصرانی طبیب کے ہاں میری آمد و رفت رہتی ہے' کیا میں اسے سلام کر سکتا ہوں؟ آپ نے جواب دیا کہ جب تمہاری اس سے کوئی حاجت ہے تو سلام کرو۔ [۲۴]

حضرت ابراہیم نخعی کا قول علامہ قرطبی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

اذا کانت لک حاجة عند یهودی اونصرانی فابدأه بالسلام۔

"جب تمہیں کسی یہودی یا نصرانی سے کوئی حاجت درپیش ہو تو اس سے ملاقات کا آغاز سلام سے کرو۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں :

فبان بهذا ان حدیث ابی هریره ﷺ ......اذا کان لغیر سبب یدعوکم الی ان تبدء وهم بالسلام من قضاء زمام اوحاجةٍ تعرض لکم قبلهم اوحق صحبةٍ اوجوارٍاوسفرٍ [۲۵]

"اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت (جس میں غیر مسلم کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے) کا تعلق بغیر کسی سبب کے سلام کرنے سے ہے' جیسے کسی حق کی ادائیگی یا کوئی حاجت جو تمہیں ان سے پیش آئے یا صحبت' ہمسائیگی اور سفر کا حق (اس طرح کا کوئی سبب ہو تو سلام کیا جا سکتا ہے)"

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ ضرورت پر ذمی کو سلام کیا جا سکتا ہے۔ ہاں بغیر کسی ضرورت کے سلام کرنا ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح کہا گیا ہے کہ ضرورت کے تحت مصافحہ بھی جائز ہے لیکن بے ضرورت ناپسندیدہ ہے۔ بطور مثال ایک ضرورت یہ بیان ہوئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان یہ محسوس کرے کہ سفر سے واپسی کے بعد وہ اپنے نصرانی پڑوسی سے مصافحہ نہ کرے

---

۲۳ نووی : شرح مسلم ج ۵ جزء ۱۴/۱۴۵

۲۴ جصاص' احکام القرآن : ۳/۵۲۶

۲۵ قرطبی' الجامع لاحکام القرآن : ۱۱/۱۱۲

تو اسے تکلیف پہنچے گی تو اسے مصافحہ کرنا چاہئے۔[۲۶]

اس طرح کے سماجی، معاشرتی، معاشی، طبّی، علمی اور عملی ضروریات کی کوئی متعین فہرست نہیں ہے، آدمی اپنے حالات اور ماحول کے لحاظ سے ان کا تعین کرے گا، جہاں کسی ضرورت کا تقاضا ہو غیر مسلم سے ملاقات، سلام اور مصافحہ بلا کراہت جائز سمجھنا چاہئے۔

تالیفِ قلب کے لئے سلام کی گنجائش

ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں شاید تالیف قلب کے لئے غیر مسلموں کو سلام کرنے کی اجازت تھی لیکن جب اسلام کو اقتدار اور استحکام حاصل ہو گیا تو اسکی ضرورت نہیں رہی۔[۲۷]

یہ بات اس وقت صحیح ہو گی جب کہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہو کہ افشاءِ سلام کا حکم پہلے اور ممانعت کا بعد میں دیا گیا۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ تالیفِ قلب کا مقصد غیر مسلموں کے قلوب کو اپنی زبان اور اپنے حسن سلوک سے اسلام کی طرف مائل کرنا بتایا گیا ہے[۲۸]۔ یہ کوئی وقتی اور ہنگامی مقصد نہیں ہے بلکہ مضبوط سے مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو بھی باقی رہے گا۔ اِلّا یہ کہ ریاست میں کوئی غیر مسلم ہی نہ ہو۔ صحیح بات یہ کہ اسلام نے جن اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی ہے سلام اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس پر اسی پہلو سے غور کرنا چاہئے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مشترک مجمع کو سلام

اگر مجلس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں موجود ہوں تو سلام کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ثبوت صریح حدیث سے ملتا ہے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ بدر سے پہلے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ سواری گدھے کی تھی۔ اس پر زین اور فدک

۲۶۔ ابن عابدین، ردالمحتار علی الدر المختار: ۵/۳۶۳۔

۲۷۔ ابن حجر، فتح الباری: ۱/۵۶۔ عینی۔ عمدۃ القاری: ۱/۱۵۷

۲۸۔ ابن عابدین، ردالمحتار علی الدر المختار: ۵/۳۶۴

چادر پڑی ہوئی تھی۔ پیچھے آپ نے حضرت اسامہؓ کو بٹھالیا۔ راستہ میں ایک ایسی مجلس سے گزر ہوا جس میں مسلمان' بت پرست مشرکین اور یہود تھے۔ ان میں مشہور منافق عبداللہ بن اُبَی بھی تھا اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ بھی مجلس میں موجود تھے۔ جب آپ قریب پہنچے تو سواری کی گرد و غبار اڑنے لگی۔ عبداللہ بن ابی نے چادر سے اپنی ناک ڈھک لی اور کہا کہ ہم لوگوں پر گرد و غبار نہ اڑاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے سلام کیا اور سواری سے اتر گئے۔ ان لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی اور قرآن کی تلاوت کی۔ عبداللہ بن ابی نے اس کے جواب میں کہا : اگر آپ کی بات حق ہے تو اس سے اچھی کون سی بات ہو سکتی ہے' لیکن آپ ہمیں ہماری مجالس میں آکر پریشان نہ کریں' آپ اپنے مقام پر جائیں' ہم میں سے جو آپ کے پاس پہنچیں انہیں اپنی باتیں سنائیں۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنی باتیں ہماری مجالس میں پیش فرمائیں' ہم انہیں پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمان اور مشرکین اور یہود ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں خاموش اور پُرسکون رہنے کی تلقین فرمائی۔ پھر آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور حضرت سعد بن عبادہؓ کے پاس پہنچے۔ فرمایا : اے سعد! کیا تم نے ابو حباب (عبداللہ بن ابی) کی باتیں سنیں۔ اس نے یہ اور یہ کہا ہے۔ انہوں نے فرمایا : اے اللہ کے رسول (ﷺ) اسے معاف فرمائیے۔ قسم خدا کی! اللہ نے آپ کو بڑا اونچا مقام عطا کیا ہے۔ مدینہ کے لوگوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اسے تاج پہنائیں گے (بادشاہ بنائیں گے) اللہ تعالیٰ نے اس حق کے ذریعہ جو اس نے آپ کو عطا کیا ہے' اس منصوبہ کو ختم کر دیا۔ اس وجہ سے اس کا دم گھٹنے لگا ہے اور یہ حرکت اس نے اسی وجہ سے کی ہے۔ چنانچہ آپ نے اسے درگزر کر دیا۔[۲۹]

اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس سے آپؐ کی دعوتی جد و جہد' مخالفین تک اسے پہنچانے کی فکر' آپ کا صبر' حِلم اور عفو و

۲۹۔ بخاری' کتاب الاستیذان' باب التسلیم فی مجلس فیه اخلاط من المسلمین والمشرکین۔ کتاب المرضی' باب عیادة المریض راکبا و ماشیا۔ مسلم' کتاب الجهاد' باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین

درگزر اور چھوٹوں کی خبرگیری اور عیادت وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی ملی جلی مجلس کو سلام کیا جاسکتا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جب تمہارا گزر کسی ایسی مجلس پر ہو جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہوں تو سلام کرو۔ [۳۰]

اس حدیث کی بنیاد پر امام نووی فرماتے ہیں کہ جس مجلس میں مسلمان اور کافر ہوں یا ایک بھی مسلمان ہو تو اسے سلام کیا جاسکتا ہے لیکن سلام کرتے وقت مسلمان کو مخاطب سمجھا جائے۔ [۳۱]

حضرت اسامہؓ کی اس حدیث میں جس مجلس کا ذکر ہے اس میں مسلمانوں میں عبداللہ بن رواحہؓ کی موجودگی کا تو ثبوت ملتا ہے لیکن یہ صراحت نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ان کو مخاطب سمجھ کر سلام کیا تھا۔ یہ بات ان احادیث کی بنیاد پر کہی گئی ہے جن میں غیر مسلموں کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا ان کا موقع و محل دوسرا ہے۔

اس سلسلہ کا ایک سوال یہ ہے کہ صرف غیر مسلموں کے مجمع میں دعوت و تبلیغ کے لئے جانا ہو تو کیا اسے سلام کیا جاسکتا ہے؟ میرے خیال میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس لئے کہ جب انفرادی نوعیت کی سماجی، معاشرتی اور طبّی ضروریات کے تحت غیر مسلم کو سلام کرنے کی فقہاء کے ہاں اجازت ملتی ہے تو دین کے عمومی مفاد اور دعوت و تبلیغ کے لئے بھی اس کی اجازت ہونی چاہئے۔ اس سے تالیفِ قلب کا بھی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے، جس کی طرف بعض فقہاء نے اشارہ کیا ہے۔

سلام کے جواب کا حکم

اب سلام کے جواب کے مسئلہ کو لیجئے۔ اس کا حکم قرآن مجید میں ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ

۳۰۔ عبدالرزاق، المصنف: ۱۶/۶۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱۲/۱۱

۳۱۔ نووی، شرح مسلم ج ۵ جزء ۱۴ ص ۱۴۵

كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ○ (النساء : ۸۶)

"جب تمہیں کوئی سلام کرے تو اسے اس سے بہتر طریقہ سے یا کم از کم اسی طرح جواب دو۔ بیشک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔"

اس آیت کی بنیاد پر علامہ قرطبی کہتے ہیں :

اجمع العلماء انّ الابتداء بالسلام سنّةٌ مرغبٌ فيها وردّه فريضةٌ [۳۲]

"علماء کا اتفاق ہے کہ سلام کے ذریعہ (ملاقات کی) ابتدا کرنا ایسی سنت ہے جس کی ترغیب دی گئی ہے۔ رہا اس کا جواب دینا تو یہ فرض ہے۔"

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابن کثیر کہتے ہیں :

ای اذا سلّم علیکم المسلم فردّوا علیه افضل مما سلّم اورُدّوا علیه بمثل ما سلم فالزیاده مندوبةٌ والمماثلةُ مفروضةٌ۔ [۳۳]

"یعنی جب تمہیں کوئی مسلمان سلام کرے تو اس نے جن الفاظ میں سلام کیا ہے ان سے بہتر یا ان ہی کے مثل الفاظ میں جواب دو۔ سلام سے زیادہ الفاظ میں جواب دینا مندوب اور پسندیدہ ہے اور ان ہی کے مثل الفاظ میں جواب دینا فرض ہے۔"

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان نے "السلام علیکم" کہا تو اس کے جواب میں "وعلیکم السلام" کہنا بھی صحیح ہے اور "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ" بھی کہا جا سکتا ہے۔ پہلی صورت اسی کے مثل جواب کی اور دوسری صورت بہتر جواب کی ہے۔ کسی مسلمان نے "السلام علیکم ورحمتہ اللہ" کہا تو اس کے جواب میں "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ" کہنا اسی جیسا جواب ہوگا اور بہتر جواب یہ ہے کہ "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" کہا جائے۔ اگر کسی نے "السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" کہا تو اس کے جواب میں "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" کہا جائے گا۔ اس میں مزید الفاظ کا اضافہ نہیں ہوگا۔ [۳۴]

---

۳۲ قرطبی : الجامع لاحکام القرآن : ۲۹۸/۵

۳۳ ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم : ۵۳۰/۱

۳۴ یہ تفصیل ابن جریر، ابن مردویہ، طبرانی اور ابن منذر کی ایک روایت میں ملتی ہے، لیکن اس ◄

ان تفصیلات کا تعلق اسلام کے ماننے والوں سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ غیر مسلم کے سلام کا بھی جواب دیا جائے گا یا نہیں؟ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں :

ردّوا السّلام علیٰ من کان یہودیًا او نصرانیًا او مجوسیًا [۳۵]

"سلام کا جواب دو، چاہے وہ یہودی یا نصرانی یا مجوسی ہو۔"

علامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ سلام کرنا نفل اور مستحب ہے لیکن اس کا جواب دینا فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، قتادہ اور ابن زید کے نزدیک مسلم اور کافر دونوں کے سلام کا جواب دینا فرض ہے، لیکن حضرت عطاء کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کے سلام کا جواب دینا تو فرض ہے، کافر کے سلام کا جواب دینا فرض نہیں ہے۔ [۳۶]

علامہ قرطبی فرماتے ہیں ذمیوں کے سلام کا جواب دینے یا نہ دینے کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ جس طرح مسلمان کے سلام کا جواب دینا واجب ہے کیا اسی طرح ذمیوں کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، شعبی اور قتادہ سورۂ نساء کی آیت سے تمسک کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ذمیوں کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے، لیکن امام مالکؒ، جیسا کہ اشہب اور ابن وہب نے ان سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ یہ واجب نہیں ہے۔ اگر جواب دیا بھی جائے تو صرف "علیک" کہا جائے۔ [۳۷]

← میں ضعف ہے۔ علامہ سیوطی نے اسے حسن کہا ہے۔ تفسیر طبری : ۸/۵۹۰-۵۸۹۔ تحقیق محمود محمد شاکر۔ ابن کثیر تفسیر ۱/۵۳۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" پر سلام ختم ہو جاتا ہے، اس پر اضافہ صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے اضافہ کیا تو اسے انہوں نے منع فرمایا۔ موطا، کتاب السلام، باب العمل فی السلام۔

۳۵۔ بخاری، الادب المفرد مع فضل اللہ الصمد : ۲/۵۳۳۔ اس کے ایک راوی عبداللہ بن ثور پر بعض محدثین نے جرح کی ہے۔ لیکن یہی روایت کسی قدر اختصار کے ساتھ طبری میں ہے۔ اس کے راویوں میں مجروح راوی نہیں ہے۔ طبری کے الفاظ ہیں : من سلم علیک من خلق اللہ فاردد علیہ وان کان مجوسیا۔ تفسیر طبری طبع جدید : ۸/۵۸۷۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے اس کی سند پر کوئی جرح نہیں کی ہے بلکہ اس کی توثیق کی ہے۔ فتح الباری : ۱۱/۴۲

۳۶۔ ماوردی، النکت والعیون : ۱/۴۱۱

۳۷۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن : ۵/۳۰۴۔ نیز ملاحظہ ہو ۱۷/۲۹۳

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مشرک کو سلام نہیں کیا جائے گا' البتہ اس کے سلام کا جواب دیا جائے گا۔ امام محمدؒ کے بقول یہی ہمارے عام فقہاء کا قول ہے۔ ۳۸

امام نووی فرماتے ہیں شوافع کا مسلک یہ ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کرنا حرام ہے لیکن جواب دینا واجب ہے۔ البتہ جواب میں وعلیکم یا علیکم کہا جائے گا' اس سے زیادہ نہیں۔ یہی اکثر علماء اور عام سلف کی رائے ہے۔ ۳۹

غیر مسلم کے سلام کا جواب کس طرح دیا جائے؟

سلف میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ سورۂ نساء میں سلام کا جواب بہتر طریقہ سے دینے یا سلام کے الفاظ دہرا دینے کا حکم ہے۔ ان میں سے پہلی صورت مسلمانوں سے اور دوسری صورت غیر مسلموں سے متعلق ہے۔ چنانچہ ابن زید کہتے ہیں۔

حقٌ علٰی کل مسلمٍ حیّی بتحیةٍ ان یحیی باحسن واذا حیاہ غیر اھل اسلام ان یرد علیہ مثل ما قال ۴۰

"جس کسی مسلمان کو بھی سلام کیا جائے اس پر واجب ہے کہ بہتر طریقہ سے جواب دے اور جب اسے اہل اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا سلام کرے تو اسی جیسا جواب دے۔"

حضرت قتادہ کہتے ہیں بہتر طریقہ سے جواب مسلمان کے لئے ہے اور سلام کرنے والے کے الفاظ ہی کو لوٹا دینا اہل کتاب کے لئے ہے۔ ۴۱

آیت میں بظاہر مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے پیچھے یہ خیال ہو کہ ایک مسلمان کا اخلاقی حق غیر مسلم کے حق سے زیادہ ہے اس لئے ایک کافر کے سلام کا جن الفاظ میں جواب دیا جاتا ہے ان سے بہتر الفاظ میں مسلمان کے سلام کا جواب دیا جانا چاہئے۔

---

۳۸ جصاص' احکام القرآن : ۵۲۵/۳

۳۹ نووی : شرح مسلم ج ۵ جزء ۱۴ ص ۱۴۵

۴۰ طبری' جامع البیان : ۵۸۸/۸

۴۱ طبری' جامع البیان : ۵۸۷/۸

یہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ اس امر میں علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غیر مسلم کے سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ بعض حضرات نے اسے ضروری بھی قرار دیا ہے۔ البتہ یہ بحث ضرور ہے کہ جواب کن حدود میں ہو اور اس کے لئے کیا الفاظ استعمال کئے جائیں۔

سلام کرنے میں یہود کی شرارت اور اس کا جواب

ہمارے خیال میں اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ایک غیر مسلم کا مجموعی رویہ کیا ہے اور کن الفاظ میں وہ سلام کرتا ہے۔ یہودِ مدینہ کی عداوت اور دشمنی بالکل نمایاں تھی۔ جب بھی موقع ملتا ان کے بغض و عناد کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ سلام بھی کرتے تو نازیبا اور غیر شائستہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ قرآن مجید کا بیان ہے :

وَاِذَا جَاءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ، حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا، فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ (المجادلہ : ۸)

"جب وہ آپؐ کے پاس آتے ہیں تو آپؐ کو سلام اس طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ پر سلام نہیں بھیجا ہے اور اپنے جی میں کہتے ہیں کہ ہماری اس حرکت پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ جہنم ان کے لئے کافی ہے، اس میں وہ داخل ہوں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے۔"

یہود کے اس رویہ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے انہیں سلام کرنے سے منع فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ ان کے شرارت آمیز سلام کے جواب میں صرف یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وہی کچھ کرے جو تم ہمارے ساتھ چاہتے ہو۔ احادیث میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہاں بعض احادیث پیش کی جا رہی ہیں۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا :

انّ اهلَ الكتاب يسلمون علينا فكيف نردّ عليهم؟
قال : قُوْلوا وَعَلَيْكُم [۴۲]

---

[۴۲] مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام وکیف یرد علیہم۔ ابوداؤد، ابواب السلام، باب فی السلام علی اہل الذمۃ

"اہل کتاب ہمیں سلام کرتے ہیں ہم انہیں جواب کس طرح دیں؟ آپؐ نے فرمایا: "وعلیکم" کہہ دو۔"

حضرت انسؓ ہی کی ایک اور روایت ہے:

اذا سلم علیکم اھلُ الکتاب فقولوا وَعَلَیْکُم [۴۳]

"جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو تم "وعلیکم" کہو۔"

بعض دوسری روایات سے اس جواب کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا سلم علیکم الیھودُ فانما یقول احدھم السّامُ علیکَ فقل وعلیکَ۔ [۴۴]

"یہود تمہیں جب سلام کرتے ہیں تو "السام علیکم" کہتے ہیں۔ تم جواب میں "وعلیک" کہہ دو۔"

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک یہودی نے "السام علیکم" کہا۔ خدمت میں جو صحابہؓ موجود تھے انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا تمہیں معلوم ہے کہ اس نے کیا کہا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس نے سلام کیا تھا۔ آپ نے فرمایا نہیں! اس نے "السام علیکم" کہا (تمہیں موت آئے یا تم اپنے دین سے اکتا جاؤ) اسے واپس بلاؤ تاکہ دریافت کیا جائے۔ اسے واپس بلایا گیا۔ دریافت کرنے پر اس نے اعتراف کیا کہ اس نے "السام علیکم" ہی کہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو تم "عَلَیکم مَا قُلتم" کہو۔ (یعنی تم پر وہ چیز طاری ہو جس کی تم نے ہمارے لئے دعا کی ہے۔ [۴۵])

ان روایات سے واضح ہے کہ یہود سلام کرنے میں بھی شرارتِ نفس اور خبثِ باطن

---

۴۳ بخاری، کتاب الاستیذان، باب کیف الرد علی اہل الذمۃ۔ مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب الخ۔

۴۴ بخاری و مسلم حوالہ سابق۔

۴۵ رواہ البزار و ابن حبان، فتح الباری: ۱۱/۴۳ و رواہ البخاری فی الادب المفرد مختصرا۔ ۵۳۲/۲-۵۳۳

کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کا شریفانہ اور باوقار انداز میں جواب دینے کی ہدایت کی گئی کہ تمہارے یہ الفاظ تمہارے ہی لئے مبارک ہوں۔ تم ہماری تباہی اور بربادی کے آرزومند ہو' خدا تمہیں اسی سے دوچار کرے۔ اس سے آگے بڑھ کر جواب میں بدزبانی اور بدکلامی سے منع کیا گیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہود کے کچھ افراد آئے اور "السام علیک" کہا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا "وعلیکم السام وَاللّعنہ" (موت تمہیں آئے اور خدا کی لعنت تم پر ہو) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عائشہ! صبر سے کام لو' درشت کلامی سے احتراز کرو' اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں رِفق وملاطفت اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا انہوں نے جو کہا کیا وہ آپؐ نے نہیں سنا؟ آپؐ نے فرمایا میں نے سنا ہے اور اس کے جواب میں "وعلیکم" کہہ دیا ہے۔ (یعنی موت اور اکتاہٹ تم پر آئے۔ یہ جواب کافی ہے) [۴۶]

جواب میں نازیبا الفاظ کے استعمال کی ممانعت

اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہود کی سازشوں اور ان کے طنز و تعریض سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپؐ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ سلام کرتے وقت غیر مہذب الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن زبانِ مبارک جواب میں نامناسب کلمات سے پاک رہی۔ اسی کی تعلیم آپ نے صحابہ کرامؓ کو دی اور فرمایا: "ہم ان کے حق میں جو دعا کریں گے وہ تو قبول ہوگی لیکن وہ جو بددعا کر رہے ہیں وہ قبول نہیں ہوگی [۴۷] اس لئے کہ ہم مظلوم اور وہ ظالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت مظلوم کو حاصل ہوتی ہے اور ظالم اس سے محروم رہتا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے یہود جس طرح "السلام علیکم" کو زبان کی لوچ سے "السام علیکم" کر دیتے ہیں اسی طرح ان کے جواب میں زبان کو گھما کر "علیکم السّام" کہنا چاہئے۔

---

۴۶ بخاری' کتاب الاستیذان' باب کیف الرد علی اہل الذمہ۔ مسلم' کتاب السلام' باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام الخ

۴۷ بخاری' کتاب الدعوات' باب قول النبی ﷺ یستجاب لنا فی الیہود الخ۔ مسلم' کتاب السلام' باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام الخ۔

اس کے معنی ہیں تم پر پتھر پڑیں یا "علاکم السلام" کہا جائے یعنی تم سے سلامتی اٹھ جائے لیکن جیسا کہ علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ ذمیوں کو برا بھلا کہنا اور ان کے ساتھ بدزبانی کرنا جائز نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جب انہیں برا بھلا کہنا چاہا تو آپؐ نے اسے ناپسند فرمایا۔ ۴۸؎

اوپر کی روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے بغض و عناد، ان کی شرارت اور ان کی بدزبانی اور بدکلامی کی وجہ سے انہیں سلام نہ کرنے یا ان کے سلام کا خاص طریقہ سے جواب دینے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن جہاں غیر مسلموں سے بہتر روابط ہوں اور وہ مسلمانوں کے ساتھ عداوت اور مخاصمت کا رویہ نہ رکھتے ہوں وہاں اگر کوئی غیر مسلم، اسلامی تعلیمات یا اسلامی معاشرہ کے زیر اثر کسی مسلمان کو "السلام علیکم" کے ذریعہ خطاب کرے تو جواب میں اس کا رویہ بھی بظاہر مختلف ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے بعض علماء نے ممانعت کے حکم کو ایسا حکم نہیں مانا ہے جو ابدی ہو اور جس پر عمل ہر حال میں لازم ہو۔ ان کے نزدیک غیر مسلم کے سلام کے جواب میں اسی طرح وعلیکم السلام کہا جا سکتا ہے جیسے مسلمان کے سلام کے جواب میں کہا جاتا ہے۔ ۴۹؎

شوافع میں سے بعض کی یہ رائے ہے کہ "وعلیکم السلام" تو کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے آگے "ورحمتہ اللہ" کا اضافہ غلط ہوگا ۵۰؎۔ لیکن امام شعبی اسے غلط نہیں سمجھتے ایک نصرانی نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواب میں "وعلیک السلام ورحمتہ اللہ" کہا۔ اس پر اعتراض کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں جی نہیں رہا ہے؟ ۵۱؎

۴۸؎ فتح الباری : ۴۵/۱۱

۴۹؎ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں : وذهب جماعة من السلف الى انه يجوزان يقال فى الرد عليهم وعليكم السلام كما يرد على المسلم- فتح الباری : ۴۵/۱۱- نیز ملاحظہ ہو عینی، عمدۃ القاری : ۳۰۶/۱۸

۵۰؎ نووی : شرح مسلم جلد ۵ جزء ۱۴ ص ۱۴۵

۵۱؎ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل : ۵۵۰/۱

سلام کے معاملہ میں ذِمّی اور حربی کافرق

بعض حضرات نے اس معاملہ میں ذمی اور حربی کا فرق کیا ہے [۵۲] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو غیر مسلم اسلامی مملکت کے شہری ہیں، جن کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اس کے ذمہ ہے اور جو اس کے امن و امان میں ہیں ان کے ساتھ سلام و کلام کا وہ انداز نہیں ہوگا جو ان لوگوں کے ساتھ اختیار کیا جاسکتا ہے جو اسلامی مملکت سے برسرپیکار ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک ذمی کو خط میں سلام لکھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ کیا آپ غیر مسلم کو سلام لکھ رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا اس نے اپنے خط میں مجھے سلام لکھا تھا میں نے اس کا جواب دیا ہے۔ [۵۳]

مشہور محدث ابن عیینہ سے سوال کیا گیا:

هَل يجوز السلام على الكافر؟ (کیا کافر کو سلام کرنا جائز ہے؟)

انہوں نے جواب دیا "نعم" ہاں دیا جاسکتا ہے۔ اور پھر سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت پڑھی:

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ... الآیۃ جس میں کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں اپنے وطن سے نہیں نکالا۔ وہ تو ان لوگوں سے قریبی تعلق رکھنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے جنگ کی، تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور اس معاملہ میں دوسروں کی مدد کی"۔ (الممتحنہ: ۸-۹) [۵۴]

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حربی اور غیر حربی یا معاہد اور غیر معاہد کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن چونکہ غیر حربی کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کرتا اس لئے اسے سلام بھی کیا جاسکتا ہے، یہ بھی حسن سلوک میں داخل ہے۔

۵۲۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: وعن بعضهم التفرقة بين اهل الذمة واهل الحرب۔ فتح الباری: ۱۱/۴۵۔ نیز ملاحظہ ہو: عینی، عمدۃ القاری: ۱۸/۳۰۶

۵۳۔ بخاری، الادب المفرد: ۲/۵۲۹

۵۴۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/۱۱۱

غیر مسلم کو سلام کے لئے مناسب الفاظ

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سلام اور اس کے جواب کے الفاظ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر مسلموں کے لئے دوسرے الفاظ استعمال کئے جانے چاہئیں۔ اس کی تائید میں وہ خط پیش کیا جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ روم ہرقل کو لکھا تھا۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم مِن محمدٍ عبد اللّٰہ ورسولہٖ الی ھرقل عظیم الروم، السّلام علٰی من اتبع الھدٰی۔ امابعد...[۵۵]

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، ہرقل کی طرف جو روم کا سربراہ ہے۔ سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔ امابعد۔

محدث ابن بطال کہتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کی دلیل ہے جن کے نزدیک اہل کتاب سے مراسلت میں وقتِ ضرورت انہیں سلام لکھنا جائز ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ والسّلامُ علٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی کا سیاق و سباق دوسرا ہے۔ اس میں ایک اصولی بات کہی گئی ہے کہ جو حق اور ہدایت پر عمل کرے اس کے لئے سلامتی ہے۔ اس میں وہ شخص شامل نہ ہوگا جو حق کی اتباع نہ کرے۔ غیر مسلموں کو جو خطوط لکھے جائیں ان میں اس طرح کا عمومی انداز اختیار کیا جاسکتا ہے۔[۵۶]

قتادہ کہتے ہیں اہل کتاب کے گھر جاؤ تو کہو : السّلامُ علٰی مِن اتبع الھدٰی (سلامتی ہے ہر اس شخص پر جو ہدایت کی اتباع کرے)[۵۷] یہی بات امام ابو یوسف نے کہی

۵۵۔ بخاری، کتاب الاستیذان، باب کیف یکتب الٰی اہل الکتاب۔ گرامی نامہ کے پورے مضمون اور اس سلسلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو : بخاری، کتاب البدء الوحی، نیز کتاب الجہاد، باب دعاء النبیؐ الناس الی الاسلام والنبوۃ۔

۵۶۔ فتح الباری : ۱۱/۴۷۔ نیز ۱/۳۸

۵۷۔ عبدالرزاق۔ المصنف : ۶/۱۲

ہے۔^۵۸^ "السّلام عَلینا وعلٰی عبادِ اللّٰہِ الصّالِحین " (سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر) جیسے الفاظ بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں^۵۹^۔

حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے ایک شخص کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا۔ بعد میں آپ کو بتایا گیا کہ یہ شخص نصرانی ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اور فرمایا کہ میرا سلام واپس کردو۔^۶۰^

امام مالک فرماتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے^۶۱^۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا بھی ایک فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ غیر مسلم کے علم میں یہ بات آجائے گی کہ سلام کے مخصوص الفاظ غیر مسلموں کے لئے استعمال نہیں کئے جاتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خصوصاً جس شخص کے عمل کو لوگ نمونہ اور دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوں اسے ایسا کرنا چاہئے تاکہ دوسرے اس سے احتراز کریں^۶۲^۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے عمل کی اس سے توجیہ کی جاسکتی ہے۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کو ایک شخص نے، جو صورت شکل سے مسلمان لگ رہا تھا، سلام کیا۔ انہوں نے جواب میں "وعلیک ورَحمة اللّٰہ وبَرکاتہ" کہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص نصرانی ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ اس کے پاس گئے اور کہا کہ اللہ کی رحمت مسلمان کے لئے ہے (لہٰذا یہ الفاظ اسی کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں) پھر اسے دعا دی : اطال اللّٰہُ حیاتکَ واکثرَ مالَکَ ووَلدَکَ (اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے اور تمہارے مال و اولاد میں اضافہ فرمائے۔^۶۳^

علامہ زمخشری کہتے ہیں :

وَلابأس بالدّعاء له بما یصلحه فی دُنیاه^۶۴^

---

۵۸ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل : ۵۵۰/۱

۵۹ فتح الباری : ۴۰/۱۱

۶۰ بخاری، الادب المفرد : ۵۳۹/۲

۶۱ موطا، کتاب السلام، باب ما جاء فی السلام علی الیہود والنصاریٰ

۶۲ فتح الباری : ۴۶/۱۱

۶۳ بخاری، الادب المفرد : ۵۳۸/۲

۶۴ الکشاف عن حقائق التنزیل : ۵۵۰/۱

"اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اسے دنیا کی صلاح اور بہتری کی دعا دی جائے"۔

خلاصۂ بحث

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ سلام اسلامی تہذیب کا شعار ہے۔ زیادہ تر علماءِ سلف اس کے قائل ہیں کہ غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جائے گا اور اس کے سلام کا جواب بھی وعلیک یا وعلیکم کی حد تک دیا جائے گا' اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن سلف ہی میں جن اصحاب نے اس سے اختلاف کیا ہے ان کے نزدیک سلام کو عام کرنے کا حکم ہے' اس لئے غیر مسلم کو بھی سلام کیا جا سکتا ہے' اس میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق صحیح نہیں ہے۔ بعض حضرات نے اس مسئلہ میں سماجی و معاشرتی تعلقات کو بھی اہمیت دی ہے۔ بعض نے ذمی اور حربی کا فرق کیا ہے' اس لئے کہ خود قرآن میں یہ فرق موجود ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ غیر مسلموں کے لئے "السلام علیکم ورحمتہ اللہ" کے مسنون الفاظ کی جگہ ان کی ہدایت اور فلاح و کامیابی کی دعا کی جائے۔ ان سب رایوں کی روشنی میں ہمیں ایک ایسے معاشرہ کے بارے میں سوچنا چاہئے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ملا جلا اور مخلوط معاشرہ ہے' جہاں دونوں کے درمیان ثقافتی' سماجی' معاشی غرض مختلف نوعیت کے تعلقات موجود ہیں اور دونوں قانونی اور دستوری روابط میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے معاشرہ میں غیر مسلموں کو مسنون طریقہ سے سلام کیا جائے تو یہ مخالفِ سلف عمل نہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح وہ آہستہ آہستہ اسلامی آداب سے مانوس ہوتے چلے جائیں اور ان کی معنویت ان پر زیادہ بہتر طریقہ سے واضح ہو جائے۔ اس میں قباحت محسوس ہو تو ان کے لئے عزت و احترام اور محبت و خیر خواہی کے دوسرے الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ اس بات کا ضرور خیال رکھنا ہو گا کہ تعلقات کے اظہار میں ایسے طریقے نہ اختیار کئے جائیں جو کسی دوسرے مذہب یا تہذیب کے مخصوص شعار کی حیثیت رکھتے ہوں اور ایسے الفاظ نہ استعمال کئے جائیں جو اسلامی عقائد سے متصادم ہوں۔

(بشکریہ : سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی' علی گڑھ' انڈیا)

سورة البقرہ

آیت ۴۷

ملاحظہ : کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ 'الاعراب 'الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کیلئے ۱ 'الاعراب کیلئے ۲ 'الرسم کیلئے ۳ 'اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۴۶ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ
اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ
الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ
وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

۲:۴۶:۱ اللغـة

۲:۴۶:۱(۱) [ثُمَّ قَسَتْ] "ثُمَّ" کے معنی و استعمال پر البقرہ: ۲۸ [۲:۲۰:۱(۴)] میں بات ہوئی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ تو "پھر" "اس کے بعد" ہے یہاں سیاقِ عبارت (قصہ) کی بنا پر اردو محاورہ میں اس کا موزوں ترجمہ "پھر بھی" بنتا ہے۔

"قَسَتْ" کا مادہ "ق س و" اور وزن اصلی "فَعَلَتْ" ہے۔ اس کی اصلی شکل "قَسَوَتْ" تھی جس میں ماقبل مفتوح اور مابعد صحیح حرفِ ساکن والی متحرک واو (وَ) ساقط ہو جاتی ہے یعنی "قَسَوَتْ = قَسَاتْ = قَسَتْ۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "قَسَا یَقْسُو قَسْوَةً" (نصر سے) کے بنیادی معنی ہیں: "نرمی سے خالی ہونا اور سختی میں بڑھ جانا" یہ فعل لازم ہی استعمال ہوتا ہے اور زیادہ تر اس کا فاعل "القلب" (دل) آتا ہے مثلاً کہتے ہیں: "قسا قلبُہ" (اس کا دل سخت ہو گیا)۔ اگر اس کا فاعل "الدرھم" (چاندی کا ایک سکہ) ہو تو اس کے معنی "کھوٹا ہونا" ہوتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: "قسا الدرھمُ" (درہم کھوٹا ہو گیا یعنی اس کی چاندی ملاوٹ کے باعث سخت ہو گئی اور اس میں خالص چاندی والی نرمی نہ رہی)۔ اور اگر اس کا فاعل "اللیل" (رات) ہو تو اس کے معنی "سخت تاریک ہونا" ہوتے ہیں۔ مثلاً کہیں گے: "قَسَا اللیلُ" (رات سخت اندھیری ہو گئی)۔

اس فعل سے اسم صفت "فاعل" اور "فعیل" دونوں وزنوں پر آتا ہے یعنی "قاسٍ" بھی اور "قَسِیٌّ" بھی۔ مثلاً کہتے ہیں "قلبٌ قاسٍ" (سخت دل) اور "درھم قَسِیٌّ" (کھوٹا درہم)۔ عربی زبان میں اس مادہ سے مزید فیہ کے بعض افعال بھی بعض معانی کے لیے آتے ہیں۔

● تاہم قرآن کریم میں اس فعل کا استعمال صرف مجرد سے آیا ہے اور وہ بھی صرف قلب (دل) کے لیے ہوا ہے۔ اس سے فعل ماضی کا یہی ایک صیغہ (قَسَتْ) تین جگہ اور بصورت اسم الفاعل مؤنث (القاسِیة) بھی تین ہی جگہ آیا ہے۔ اور ایک جگہ مصدر "قَسْوَة" آیا ہے۔

● زیرِ مطالعہ لفظ (قَسَتْ) اس فعل مجرد سے فعل ماضی صیغہ واحد مؤنث غائب ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے "وہ سخت ہو گئی"۔ یہاں چونکہ اس کا فاعل (جیسا کہ آگے آرہا ہے) "قلوبکم" (تمہارے دل) ہے اس لیے اردو میں با محاورہ ترجمہ "سخت ہو گئے" (تمہارے دل) سے کیا گیا ہے۔ البتہ بعض مترجمین نے چونکہ سیاق عبارت اور بیان قصہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے "ثُمَّ" کا ترجمہ "پھر بھی" کیا تو فعل "قَسَتْ" کا ترجمہ "سخت رہے / سخت ہی رہے" سے کیا ہے۔

[قُلُوْبُكُمْ] میں آخری ضمیر مجرور "كُمْ" (بمعنی تمہارے) ہے اور اس سے پہلا لفظ "قُلُوب" بروزن "فُعُوْلٌ" ہے جو لفظ "قَلْبٌ" بروزن "فَعْلٌ" کی جمع مکسر ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب و معنی کے علاوہ لفظ "قلوب" کے بارے میں مفصل بحث البقرہ: ۷ اور یعنی [۲:۶:۱(۲)] اور [۲:۸:۱(۶)] میں ہو چکی ہے۔

[مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ] اس مرکب کے تینوں اجزاء "من" "بعد" اور "ذٰلک" بلکہ اس پورے مرکب کے معنی وغیرہ پر البقرہ: ۵۲ [۲:۳۳:۱(۷)] اور البقرہ: ۶۴ [۲:۴۱:۱(۴)] کے بعد بات ہو چکی ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "اس کے بعد سے"۔ تاہم بعض مترجمین نے سیاق عبارت اور بیان قصہ کی بناء پر اس کا ترجمہ "اس کے بعد بھی" اور "اس سب (کچھ) کے بعد" کے ساتھ کیا ہے۔ "بعد" کا لفظ اردو میں اتنا متعارف اور مستعمل ہے کہ اس کا ترجمہ "... کے پیچھے" کرنا الٹا خارج از محاورہ لگتا ہے۔

[فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ] یہ "فَ" (پس / چنانچہ) + "هِيَ" (وہ۔ مؤنث واحد) + "كَ" (مانند / جیسا / مثل) + "الحِجَارة" (پتھروں) کا مرکب ہے۔ لفظ "الحجارة" پر تفصیلی بحث البقرہ: ۲۴ [۲:۱۷:۱(۱۳)] میں گزر چکی ہے۔ فاء (ف) کا ترجمہ یہاں "پس" کے علاوہ (جو اس کا عام ترجمہ ہے) بعض حضرات نے "چنانچہ" اور "سو" سے کیا ہے۔ "ھی کالحجارۃ" کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے: "وہ (مؤنث) ہے پتھروں کی مانند"۔ "هِيَ" کا واحد مؤنث صیغہ "قلوب" کے جمع مکسر ہونے کی وجہ سے ہے جن کو پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس لیے "پتھروں" کی مناسبت سے بامحاورہ اردو ترجمہ ہوگا "وہ ہیں مانند پتھروں کے / یا وہ پتھروں کی مانند ہیں"۔ تاہم اردو میں لفظ "پتھر" جمع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے بعض نے اس کا ترجمہ "وہ مثل پتھر کے ہیں / وہ پتھر کی طرح ہیں" سے بھی کیا ہے۔ جب کہ بعض نے اس کا ترجمہ "گویا وہ پتھر ہیں" کیا ہے۔ مفہوم درست سہی مگر یہ "ھی کالحجارۃ" سے زیادہ "کأنّھا الحجارۃ" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اور بعض نے "وہ ہو گئے جیسے پتھر" سے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں "ہو گئے" اپنی طرف سے (بلا ضرورت) اضافہ ہے۔

۲:۴۶:۱(۲) [اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً] اس میں تین کلمات ہیں "اَوْ"، "اَشَدُّ" اور "قَسْوَة"۔ ہر ایک کی الگ الگ لغوی تشریح یوں ہے۔

① "اَوْ" حرف عطف کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور یہ تخییر[1] (دو چیزوں میں سے ایک لینے کی اجازت)، اباحۃ[2] (دو چیزوں میں سے ایک یا دونوں ہی لینے کی اجازت)، ابہام[3] (دو چیزوں کے بارے میں بات کو واضح نہ کرنا) شک[4] (دو چیزوں کے درست یا غلط ہونے کے بارے میں شک

کرنا) کے معنی دیتا ہے اور کبھی یہ حرفِ اضراب (بَلْ) کے معنی میں اور کبھی "اِلٰی اَنْ" (یہاں تک کہ) اور "اِلَّآ اَنْ" (مگر یہ کہ) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اس لفظ (اَوْ) کا اردو ترجمہ حسبِ موقع "یا"، "یا پھر"، "یا شاید"، "بلکہ"، "تاوقتیکہ" اور "مگر یہ کہ" کی صورت میں کیا جاسکتا ہے نیز دیکھئے البقرہ: ۱۹ [۲: ۱۴: ۱ (۱)] میں۔

● زیرِ مطالعہ عبارت میں "اَوْ" اگرچہ عطفِ معنیٔ ابہام بھی لیا جاسکتا ہے اور بہت سے مترجمین نے اس کا ترجمہ "یا" سے ہی کیا ہے۔ تاہم سیاقِ عبارت کے لحاظ سے اسے یہاں حرفِ اضراب (بَلْ) کے معنی میں لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض مترجمین نے یہاں اس کا ترجمہ "بلکہ" سے ہی کیا ہے۔ اور یہ اردو محاورے کے لحاظ سے بھی اور مفہومِ عبارت کے لحاظ سے بھی بہتر ترجمہ ہے۔

② "اشد" کا مادہ "ش د د" اور وزن "اَفْعَلُ" ہے۔ یہ دراصل تو "اَشْدَدُ" تھا پھر پہلے "د" کی حرکت فتحہ اس کے ماقبل صحیح حرف ساکن (ش) کو منتقل ہوئی اور دونوں "د" مدغم ہوگئے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "شَدَّ یَشُدُّ شَدًّا و شِدَّةً" (نصر سے) کے بنیادی معنی ہیں: مضبوط، بھاری یا قوی ہونا/کرنا۔ پھر یہ لازم اور متعدی دونوں طرح (کسی صلہ کے بغیر بھی اور بعض صلات کے ساتھ بھی) مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) "مضبوط یا بھاری ہونا" کہتے ہیں "شَدَّ الشَّیْءُ" (چیز مضبوط ہوگئی)۔ (۲) "گرہ کو مضبوط باندھنا" کہتے ہیں "شَدَّ الْعُقْدَةَ" (اس نے گرہ مضبوط باندھی) (۳) "کسی کی مدد کرنا یا اس کو طاقت دینا" مثلاً کہتے ہیں: "شَدَّ عَضُدَهٗ" (اس کا بازو مضبوط کیا) اور "شَدَّ اَزْرَهٗ" (اس نے اس کی کمر یا قوت کو مضبوط کیا) اور یہ دونوں استعمال قرآن میں بھی آئے ہیں۔ دیکھئے القصص: ۳۵ اور طٰہٰ: ۳۱ (۴) "سفر کی تیاری کرنا" کہتے ہیں "شَدَّ رِحَالَهٗ" (اس نے اپنے کجاوے باندھے یعنی سفر کی تیاری کی) (۵) "کسی کو سخت گرفت میں لے لینا" اس صورت میں اس کے ساتھ "علیٰ" کا صلہ آتا ہے جیسے قرآن کریم (یونس: ۸۸) میں ہے "وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" (اور تو ان کے دلوں کو سخت گرفت میں لے لے)۔

● قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل مجرد کے مختلف صیغے چھ جگہ آئے ہیں اور زیادہ تر یہ بطور فعل متعدی ہی استعمال ہوا ہے۔ البتہ بعض مشتقات مثلاً "اَشَدّ" اور "شَدِید" فعل لازم سے آئے ہیں۔ اور مجرد کے علاوہ مزید فیہ کے بابِ افتعال سے بھی فعل کا ایک صیغہ قرآن کریم میں ایک جگہ (ابراہیم: ۱۸) آیا ہے اس کے علاوہ مختلف مشتقات (اَشَدّ، شدید، اشدّاء، شِداد وغیرہ) متعدد (۹۴)

جگہ آئے ہیں جن پر حسبِ موقع بات ہوگی اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

● یہاں لفظ "اشدّ" اپنے فعل مجرد سے افعل التفضیل کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں "نسبتاً زیادہ شدت یا سختی والا" یا "زیادہ سخت"۔ "شدید تر"۔ یہ لفظ قرآن کریم میں بلحاظ ترکیب تین طرح استعمال ہوا ہے (اور افعل التفضیل عموماً ان تین میں سے ہی کسی صورت میں استعمال ہوتا ہے) (۱) "مِنْ" کے ساتھ یعنی کسی ایک چیز سے مقابلہ کے طور پر "زیادہ سخت" کے معنی میں۔ جیسے "اشدّ مِنَ القتل" (البقرہ: ۱۹۱)۔ (۲) مضاف ہو کر یعنی مضاف الیہ میں شامل تمام چیزوں سے بڑھ کر سخت جیسے "الی اشدِّ العذاب" (البقرہ: ۸۵) (۳) تمیز کے ساتھ یعنی "فلاں بات کے لحاظ سے زیادہ سخت" جیسے "اشدّ قوۃ" (محمد: ۱۳) اور قرآن کریم میں اس لفظ (اشدّ) کا زیادہ استعمال اسی تمیزی (تمیز والی) صورت میں ہوا ہے اور یہاں (زیرِ مطالعہ عبارت میں) بھی یہ لفظ تمیز کے ساتھ ہی آیا ہے جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

③ "قَسْوَۃً" کا مادہ "ق س و" اور وزن "فَعْلَۃً" ہے۔ (یہاں یہ لفظ منصوب آیا ہے جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی) اس مادہ سے فعل مجرد اور اس کے معنی پر ابھی اوپر [۲: ۴۶: ۱ (۱)] میں بات ہوئی ہے۔ یہ لفظ (قسوۃ) اس فعل مجرد کا مصدر ہے جس کے معنی بطور مصدر "سخت ہونا" ہیں اور بطور اسم "سختی" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے بلحاظ ترکیب (جس کی مزید وضاحت آگے "الاعراب" میں آئے گی) یہاں یہ لفظ (قسوۃ) تمیز کے طور پر آیا ہے اور اس کا ترجمہ ہوگا "بلحاظ قسوۃ (سختی/سخت ہونے) کے"۔ "یا سختی کے لحاظ سے"۔

● اس طرح زیرِ مطالعہ حصۂ عبارت (أو أشد قسوۃ) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "یا/بلکہ زیادہ سخت بلحاظ سختی کے"۔ اردو میں "شِدّۃ" اور "قَسْوَۃ" دونوں کا ترجمہ "سختی" ہی کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ "اشدّ کی "شِدّۃ" میں سختی کا درجہ یا مقدار (کی فضیلت تفضیل۔ برتری) کی طرف اشارہ ہے (یعنی کتنا سخت) اور "قَسْوَۃ" میں سختی کی نوعیت یا قسم (مثلاً ٹھوس ہونا، بے رحم ہونا، تاریک ہونا وغیرہ) مراد ہے۔ اس لیے اردو تراجم میں اس کا قریب ترین ترجمہ سختی میں زیادہ سختی میں بڑھ کر سے کیا گیا ہے۔ تاہم یہاں ترجمہ کرتے وقت بعض محذوفات کو بھی ذہن میں رکھنا (Understood سمجھنا) پڑتا ہے اس لیے اس حصۂ عبارت (أواشدّ قسوۃ) کے ترجمہ پر مزید بحث حصۂ "الاعراب" میں ہوگی اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

[وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَۃِ لَمَا] اس میں کل پانچ کلمات ہیں یعنی یہ "وَ" (اور) + "اِنَّ" (بے شک) + "مِنْ" (میں سے) + "الحجارۃ" (پتھروں) + "لَ" (البتہ۔ ضرور) + "مَا" (وہ جو کہ) کا مرکب ہے اور ان تمام

کلمات پر اس سے پہلے بات ہو چکی ہے [اگر ضرورت ہو تو "وَ" کے لیے [۲: ۷: ۱ (۱)] "اِنَّ" کے لیے [۲: ۵: ۱] "مِنْ" کے لیے [۲: ۲: ۱ (۵)] "الحجارۃ" کے لیے [۲: ۱۷: ۱ (۱۳)] "لَ" (لامِ تاکید) کے لیے [۲: ۴۱: ۱ (۶)] اور "ما" (موصولہ) کے لیے (جو واحد جمع مذکر مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے) [۲: ۲: ۱ (۵)] اور [۲: ۱۹: ۱ (۲)] کو دیکھ لیجئے]

اس طرح اس حصۂ عبارت (وانّ من الحجارۃ لَمَا) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے: "اور بے شک پتھروں میں سے البتہ/ضرور وہ ہے جو کہ"۔ اسی کو بامحاورہ اور سلیس اردو میں بعض مترجمین نے "اور پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو" سے ترجمہ کیا ہے مگر اس میں "اِنَّ" اور "لَ" کا ترجمہ نظر انداز کرنا پڑا ہے۔ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ "پتھروں میں تو/ پتھروں میں تو بعضے/ پتھروں میں تو کچھ ایسے ہیں جو" سے کیا ہے جبکہ بعض نے جمع کے لیے بھی "پتھر" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی "بعضے پتھر تو/ بعض پتھر تو/ اور پتھر تو کوئی ایسا (بھی) ہے جو کہ" کی صورت میں۔ اس طرح ترجمہ میں "تو" کے لگانے سے "اِنَّ" (بے شک) کا مفہوم آ گیا ہے۔ اور "کوئی" اور "بعض"/"بعضے" کے ساتھ ترجمہ "مِنْ" (میں سے) کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ یعنی یہ "مِنْ" تبعیضیہ ہے۔

۲: ۴۶: ۱ (۳) [یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ] اس میں بھی تین لفظ وضاحت طلب ہیں۔ یَتَفَجَّرُ مِنْهُ (مرکب جاری) اور الانھر۔ ہر ایک کا الگ الگ (پہلے) بیان یوں ہے۔ پھر بعد میں مجموعی ترجمہ پر بات ہو گی۔

① "یَتَفَجَّرُ" کا مادہ "ف ج ر" اور وزن "یَتَفَعَّلُ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب، معانی اور استعمال پر البقرہ: ۶۰ [۲: ۳۸: ۱ (۵)] میں بات ہوئی تھی۔ "یتفجر" اپنے مادہ سے باب تفعّل کا فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب ہے اس باب سے فعل "فَجَّرَ۔ یُفَجِّرُ تَفْجِیْرًا" کے معنی ہیں: زور سے پھوٹ کر نکلنا، پھٹ کر باہر نکل آنا: زیادہ تر پانی کے پھوٹ نکلنے (چشمہ وغیرہ کی صورت میں) کے لیے آتا ہے۔

② "مِنْهُ" (مِنْ + ہ) کا ترجمہ ضمیر واحد مذکر (ہ) کی وجہ سے "اس میں سے" ہونا چاہیے مگر کچھ تو "مَا" (لَمَا والا) میں جمع کا مفہوم بھی موجود ہے اور کچھ سیاق (سابقہ عبارت) کے "پتھروں" کے ساتھ ملا کر ترجمہ کرنے کے لیے "ان سے/ان میں سے" کی صورت میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

③ "الانھر" جو "نھر" کی جمع مکسر ہے۔ اس لفظ کے مادہ، وزن، فعل مجرد کے باب وغیرہ پر مفصل بحث البقرہ: ۲۵ [۲: ۱۸: ۱ (۶)] میں گزر چکی ہے "الانھار" کا اردو ترجمہ "نہریں"،

ندیاں اور دریا سے کیا گیا ہے۔ بعض نے اس کا ترجمہ "چشمے" کیا ہے جو حقیقت کے اعتبار سے تو زیادہ درست ہے (چشموں سے ہی ندیاں/ دریا وجود میں آتے ہیں) تاہم لفظ کے لحاظ سے نہر، ندی یا دریا والا ترجمہ قریب تر ہے۔

● اس عبارت (یتفجر منہ الانھر) میں "منہ" کی ضمیر واحد کی طرح صیغہ فعل "یتفجر" بھی واحد مذکر غائب ہے۔ اس لحاظ سے اس کے پہلے حصے (یتفجر منہ) کا ترجمہ ہونا چاہیے "پھوٹ نکلتا ہے/ جاری ہوتا ہے اس میں سے" مگر ضمیر "ہ" کے "ما" کا عائد ہونے کی بنا پر (جو واحد جمع مذکر مؤنث سب کے لیے ہے) اور فعل "یتفجر" کے فاعل (الانھر = دریا، ندیاں، نہریں) کے ترجمہ کی اردو میں تذکیر و تانیث کی مناسب سے اردو ترجمہ "پھوٹ نکلتی ہیں/ جاری ہوتی ہیں/ بہہ نکلتی ہیں" کے ساتھ بھی کیا گیا ہے اور "بہہ نکلتے ہیں" وغیرہ کی شکل میں بھی۔

[وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا] اس کے بھی تمام کلمات پہلے بیان ہو چکے ہیں یعنی یہ "وَ" (اور) + "اِنَّ" (بے شک) + "مِنْهَا" (اس میں سے) + "لَمَا" (البتہ وہ جو کہ) کا مرکب ہے اور اس کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "اور بے شک اس (مؤنث) میں سے البتہ کوئی وہ ہے جو کہ"۔ یہاں بھی کچھ تو ضمیر مؤنث "ھا" کے پتھروں کے لیے ہونے کی وجہ سے اور کچھ "مَا" (لما والا) میں واحد جمع مذکر مؤنث سب کا مفہوم موجود ہونے کی وجہ سے بامحاورہ اردو میں اس عبارت (وان منھا لما) کے تراجم مختلف طریقے پر کیے گئے ہیں مثلاً "ان میں سے تو وہ بھی ہیں/ ایسے بھی ہیں جو/ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ/ کچھ وہ ہیں جو/ بعضے وہ ہیں جو" کی صورت میں۔ یہاں بھی محاورہ کی خاطر "اِنَّ" کا ترجمہ نظر انداز کرنا پڑا ہے۔ اور یہاں بھی "کوئی، کچھ، بعض" کا مفہوم "مِنْ" (منھا) میں موجود ہے۔

۲:۴۶:۱ (۴) [یَشَّقَّقُ] کا مادہ "ش ق ق" اور وزن اصلی "یَتَفَعَّلُ" ہے۔ یہ دراصل "یَتَشَقَّقُ" تھا۔ اور اس کا اسی طرح (یعنی بصورت اصلی) استعمال بھی درست ہے۔ تاہم بعض دفعہ اہل عرب باب تفعل کے فاء کلمہ "ت ث د ذ ز س ش ص ض ط ظ" (۱۱ حروف) میں سے کسی حرف کے ہونے کی صورت میں "تاء تفعل" کو بھی اسی حرف میں بدل کر مدغم کر دیتے ہیں اور پھر ماضی، امر اور مصدر کے شروع میں حرف مشدد (مدغم) کو پڑھنے کے لیے ہمزۃ الوصل بھی لگاتے ہیں۔ مضارع میں اس (ہمزۃ الوصل) کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یوں یہ لفظ "یتشقق" کے علاوہ بصورت "یَشَّقَّقُ" بھی پڑھا، بولا اور لکھا جاتا ہے۔ یہاں اس کی قرأت تبدیل شدہ شکل کے ساتھ ہے۔

● اس مادہ (ش ق ق) سے فعل مجرد "شَقَّ یَشُقُّ شَقًّا" (نصر سے) بطور فعل لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے بنیادی معنی ہیں "پھٹ جانا اور پھاڑ دینا"۔ پھر اس سے یہ متعدد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) جانور کی "ناب" (پانچواں دانت جسے "کچلی" بھی کہتے ہیں) نکل آنا۔ کہتے ہیں "شَقَّ النَّابُ" (یعنی مسوڑھا پھاڑ کر کچلی نکل آئی) (۲) "نباتات کا زمین پھاڑ کر نکل آنا" کہتے ہیں "شَقَّ النَّبتُ"۔ (۳) کسی چیز میں دراڑ ڈال دینا" جیسے "شَقَّ الزُّجَاجَ" (اس نے شیشہ میں دراڑ ڈال دی) (۴) "نہر کھودنا" کہتے ہیں "شَقَّ النَّهرَ" (اس نے نہر کھود نکالی) (۵) "مشکل اور دشوار ہونا" کہتے ہیں "شَقَّ الامرُ علیه" (بات اس پر دشوار ہوئی) اور (۶) "علیٰ" کے صلہ کے ساتھ ہی یہ "کسی پر دشواری ڈالنا" کے معنی بھی دیتا ہے مثلاً کہیں گے: "شَقَّ علیٰ فلانٍ" (اس نے اسے دشواری میں ڈالا)۔

● تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے صرف دو صیغے دو ہی جگہ وارد ہوئے ہیں ایک جگہ (عبس: ۲۶) "پھاڑنا" کے معنی میں اور دوسری جگہ (القصص: ۲۷) "دشواری/مشقت میں ڈالنا" کے معنی میں۔ باقی کسی معنی کے لیے یہ فعل مجرد قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا۔ فعل مجرد کے علاوہ اس مادہ سے مزید فیہ کے ابواب مفاعلہ، تفعل اور انفعال سے بھی افعال کے مختلف صیغے ۱۵ جگہ آئے ہیں اور مختلف مصادر اور مشتقات بھی دس گیارہ جگہ آئے ہیں۔ ان سب پر حسب موقع بات ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ

● زیر مطالعہ لفظ "یَشَّقَّقُ" اپنے مادہ سے باب تفعل کا صیغہ مضارع (واحد مذکر غائب) ہے۔ اس باب سے فعل "تَشَقَّقَ یَتَشَقَّقُ تَشَقُّقًا" (جو بدل کر بصورت "اِشَّقَّقَ یَشَّقَّقُ اِشَّقُّقًا" بھی استعمال ہوتا ہے) ہمیشہ بطور فعل لازم ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں "پھٹ جانا، دراڑیں نمودار ہونا یا پڑنا"۔ قرآن کریم میں اس مادہ سے اس باب (تفعل) سے فعل کے کل دو صیغے تین جگہ آئے ہیں جن میں سے ایک یہ زیر مطالعہ صیغہ ہے۔ اس کا ترجمہ ہے "پھٹ جاتا ہے" جسے بیشتر مترجمین نے یہاں "پتھروں میں سے بعض" کو ملحوظ رکھتے ہوئے جمع کے صیغے کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی "پھٹ جاتے ہیں/شق ہو جاتے ہیں" کی صورت میں۔

۲: ۴۶: ۱ (۵) [فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ] یہ جملہ کل پانچ کلمات کا مجموعہ ہے یعنی "فَ" (پس/چنانچہ) + "یخرج" (نکلتا ہے/نکل آتا ہے) + "مِنْ" (سے) + "هُ" (اس) + "الماءُ" (پانی) سے مرکب ہے۔ اس میں فعل "یَخْرُجُ" جس کا مادہ "خ ر ج" اور وزن "یَفْعُلُ" ہے کے فعل مجرد کے باب معنی و غیر پر البقرہ: ۲۱ [۲: ۱۶: ۱ (۱۱)] میں بات ہوئی تھی۔ اس فعل مجرد سے قرآن کریم میں ماضی کے مختلف

صیغے ۱۳ جگہ اور مضارع کے صیغے قریباً ۴ جگہ آئے ہیں۔ "مِنـہ" = اس میں سے اور "الماءُ" (جس کا اردو ترجمہ "پانی" ہے) کا مادہ "م و ہ" اور وزن اصلی (لام تعریف نکال کر) "فَعَلٌ" ہے۔ اصلی شکل "مَوَہٌ" تھی جس میں واو متحرک ماقبل مفتوح الف میں بدل کر لفظ "مَاہٌ" بنتا ہے۔ اور اس میں خلافِ قیاس "ہ" کو "ء" میں بدل دیتے ہیں۔ اس کی جمع مکسر "میاہٌ" اور "امواہ" ہے جس میں "ہ" پھر لوٹ آتی ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے بارے میں (جو قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہوا) البقرۃ: ۲۲ [۲:۱۶:۱(۱۰)] میں بات ہوئی تھی۔

● اس طرح "فیخرج منہ الماء" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے: "پس نکلتا ہے اس میں سے پانی"۔ جسے بعض مترجمین نے مزید بامحاورہ بناتے ہوئے "اس میں سے پانی جھرتا / رستا / جھڑ جاتا / نکل آتا / نکلنے لگتا ہے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے یہاں سیاقِ عبارت میں پتھروں (الحجارۃ) کے ذکر اور ان کے لیے مؤنث ضمیر (ھا) کی وجہ سے "منہ" کی ضمیر مذکر کے باوجود یہاں "ان میں سے" کے ساتھ ترجمہ کر ڈالا ہے جسے بلحاظ مفہوم ہی درست کہہ سکتے ہیں۔

[وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا] یہی عبارت ابھی اوپر [۲:۴۶:۱(۴)] سے پہلے گزر چکی ہے جہاں مختلف تراجم مع وجہ بیان ہوتے ہیں۔

۲:۴۶:۱(۶) [يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ] اس میں صرف دو لفظ "یھبط" اور "خشیۃ" لغوی لحاظ سے وضاحت طلب ہیں۔

"يَهْبِطُ" کا مادہ "ہ ب ط" اور وزن "يَفْعِلُ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (ھبط یھبط = نیچے اترنا / گرنا) کے باب معنی اور استعمال کا بیان البقرۃ: ۳۶ [۲:۲۶:۱(۱۷)] میں گزر چکا ہے۔

"خَشْيَةٌ" کا مادہ "خ ش ی" اور وزن "فَعْلَةٌ" ہے (عبارت میں لفظ مجرور بالجر "من" ہے)۔ اس سے فعل مجرد "خشِیَ ... یَخْشَی خَشْیَۃً" (سمع سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: "... سے ڈرنا ... کا خوف رکھنا"۔ بعض کتب لغت (مثلاً المعجم الوسیط اور البستان) میں ہے کہ اس فعل کے معنی میں کسی کی تعظیم اور ہیبت کے سبب سے ڈرنے کا مفہوم ہوتا ہے بلکہ یہی اس کے حقیقی اور بنیادی معنی ہیں۔ یہ فعل عموماً متعدی بنفسہ استعمال ہوتا ہے جیسے "خَشِیَ رَبَّہٗ" (البیّنۃ: ۸) "وہ اپنے رب سے ڈرا"۔ کبھی اس کا مفعول "اَنْ" سے شروع ہونے والا جملہ ہوتا ہے جو محلاً منصوب ہوتا ہے جیسے "خشِیتُ اَنْ تقولَ" .... (طٰہٰ: ۹۴) میں ہے (میں ڈرا کہ تو کہے گا...) اور کبھی اس فعل کے ساتھ "مِنْ" کا صلہ بھی لگتا ہے یا "اَنْ" سے پہلے "ب" کا صلہ بھی لگتا ہے مثلاً کہتے ہیں "خشِیَ

الموتَ ومِن الموتِ وبأنْ یموتَ" (سب کا مطلب ہے وہ موت سے ڈرا)

● تاہم قرآن کریم میں یہ فعل ان صلات ("مِنْ" یا "باء") کے ساتھ کہیں استعمال نہیں ہوا بلکہ مفعول بنفسہ کے ساتھ آیا ہے۔ البتہ بعض دفعہ اس کا مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جاسکتا ہے اور عموماً اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے۔ جیسے "سیذّکّر مَن یخشی" (الاعلیٰ: ۱۰) میں ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے مختلف صیغے ۳۹ جگہ اور مصدر "خشیة" مفرد یا مرکب صورت میں کل آٹھ دفعہ آیا ہے۔ لفظ "خشیة" جو اس فعل مجرد کا مصدر (بمعنی "ڈر رکھنا") ہے بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے یعنی "ڈر یا خوف" کے معنی دیتا ہے ویسے اردو میں یہ لفظ بھی تائے مبسوط کی املاء (خشیت) اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ متعارف ہے۔

● اس طرح زیر مطالعہ عبارت (یھبط مِن خشیةِ اللہ) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "نیچے گر پڑتا ہے ڈر اللہ کے سے" جس کی سلیس اردو صورت "اللہ کے ڈر سے گر پڑتا ہے" بنتی ہے کیونکہ "گر پڑنا" میں "نیچے" کا مفہوم موجود ہے۔ بعض مترجمین نے "خشیة" کے بنیادی معنی کی بناء پر "اللہ کی ہیبت سے نیچے آگرتا ہے" سے ترجمہ کیا ہے جو عمدہ ترجمہ ہے اور بیشتر مترجمین نے یہاں بھی سیاق (عبارت کے سابقہ حصے) میں الحجارة (پتھروں) کے ذکر کی بناء پر فعل مضارع کے صیغہ واحد (مذکر غائب) ہونے کے باوجود ترجمہ بصورت جمع ہی کر دیا ہے یعنی "گر پڑتے / نیچے لڑھک آتے ہیں / اللہ کے ڈر سے / خدا تعالیٰ کے خوف سے"۔

۲:۴۶:۱(۷) [وَمَا اللّٰهُ بِغَـافِلٍ عَـمَّا تَعْـمَلُوْنَ] اس عبارت (جو ایک مکمل جملہ ہے) کے تمام کلمات (ماسوائے "غافِل" کے جو اردو میں بھی مستعمل ہے) کی لغوی تشریح اور معنی وغیرہ پہلے کئی جگہ بیان ہوئے ہیں۔

مثلاً "وَ" (عاطفہ یا مستانفہ بمعنی "اور") پر [۲:۷:۱(۱)] میں "مَا" (الحجازیة یا نافیہ بمعنی "نہیں ہے") پر [۲:۲:۱(۵)] میں اسم جلالت (اللّٰہ) پر بسم اللہ کی بحث میں "بِغافل" کی باء (ب) کا الگ ترجمہ نہیں ہوتا یہ مَا الحجازیہ کی خبر پر آنے والی "ب" ہے جسے نحوی باء زائدہ کہتے ہیں (لفظ "غافل" پر ابھی بات ہو گی)۔ "عَمَّا" عن + ما ہے جس میں "عَنْ" بمعنی "سے" ہے اور اس کا تعلق "غافل" کے ساتھ "صلہ" کا ہے (جیسا کہ ابھی بیان ہو گا) اور "مَا" یہاں موصولہ بمعنی "جو کچھ" ہے اس پر [۲:۲:۱(۵)] میں اور "تعملون" (تم کرتے ہو) جو فعل عمِل یعمَل (کرنا) سے مضارع کا صیغہ ہے اس پر [۲:۱۸:۱(۲)] میں بات ہو چکی ہے۔

● لفظ "غافلٍ" (جو عبارت میں "بِ" کی وجہ سے مجرور ہے) کا مادہ "غ ف ل" اور وزن "فاعِلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "غفَل . . . یغفُل غَفْلَةً" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے عام مشہور معنی ہیں: ". . . . سے بے خبر ہونا"۔ یہ فعل متعدی ہے اور زیادہ تر "عَن" کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "غفَل عن الشیئِ" (وہ اس چیز سے غافل یا بے خبر رہا)۔ اگر یہ فعل متعدی بنفسہ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں: ". . . . کے بارے میں بے توجہی سے کام لینا" یا ". . . . پر پردہ ڈال دینا"۔ تاہم یہ استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا۔ بلکہ قرآن کریم میں تو اس فعل مجرد سے مضارع کا ایک صیغہ "تَغْفُلُون" صرف ایک جگہ (النساء: ۱۰۲) آیا ہے۔ اور اس مادہ سے مزید فیہ کے بھی صرف بابِ افعال سے ماضی کا صرف ایک ہی صیغہ "اَغْفَلْنا" بھی ایک ہی جگہ (الکہف: ۲۸) آیا ہے البتہ اس فعل مجرد سے مصدر و دیگر مشتقات بکثرت (۳۱ جگہ) آئے ہیں۔

● لفظ "غافل" اس فعل مجرد سے صیغہ اسم الفاعل ہے جس کے معنی ہیں "بے خبر" اور خود لفظ "غافل" بھی اردو میں مستعمل ہے۔ البتہ عربی میں اگر اسم الفاعل کے بعد بھی مفعول (جس سے بے خبری بیان کی جائے) مذکور ہو تو فعل کی طرح اسم الفاعل کے بعد بھی "عَنْ" کا صلہ آئے گا۔ جیسے اس زیرِ مطالعہ آیت میں "غافل" کے بعد "عما" (عن ما) آیا ہے۔ البتہ بعض دفعہ مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جیسے "واھلھا غافلون (الانعام: ۱۳۱) میں ہے۔ ایسے موقع پر مفعول سیاقِ عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے یعنی کس سے غافل ہے؟

● اس طرح یہاں "وما اللہ بغافل عما تعملون" کا لفظی ترجمہ ہو گا: "اور نہیں ہے اللہ بے خبر اس سے جو کچھ تم کرتے ہو"۔ اور اسی کی سلیس اور بامحاورہ صورت ہے "اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں" یا "جو کچھ بھی تم لوگ کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں"۔ بعض مترجمین نے "عما تعملون" کا ترجمہ اردو محاورہ کی بنا پر اور عربی کے "ما" کو (جو عمّا میں ہے) مصدریہ (دیکھئے [۲:۲:۱(۵)]) سمجھ کر "تمہارے کام سے/ تمہارے کاموں سے/ تمہارے اعمال سے/ تمہارے عملوں سے/ تمہارے کرتوتوں سے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے جو مفہوم اور محاورہ کے اعتبار سے درست ہیں۔ تاہم جن حضرات نے فعل مضارع کے ساتھ (تعملون کا) ترجمہ کیا ہے وہ اصل لفظ سے زیادہ قریب ہے اور اس سے اردو محاورے میں بھی کوئی خرابی تو واقع نہیں ہوتی۔

۲:۴۶:۲ الإعراب

زیرِ مطالعہ آیت چھ جملوں پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے دو جملوں کو فائے عاطفہ کے ذریعے

ملاکر ایک جملہ بنا دیا گیا ہے۔ باقی ہر جملے کے آخر پر وقف مطلق کی علامت (ط) ڈالی گئی ہے۔ الگ الگ جملوں کی اعرابی ترکیب یوں ہے:

(۱) ثم قسَتْ قلوبُکم من بعد ذلك

[ثم] حرف عطف برائے ترتیب وتراخی ہے (یعنی اس کے کچھ عرصہ بعد) [قَسَتْ] فعل ماضی صیغہ واحد مؤنث غائب ہے [قلوبُکم] مضاف (قلوب) اور مضاف الیہ (کم) مل کر فعل "قَسَتْ" کا فاعل (لہذا) مرفوع ہے علامتِ رفع "بُ" کا ضمہ (ـُـ) ہے۔ قلوب کے جمع مکسر ہونے کی وجہ سے صیغۂ فعل (قَسَتْ) مؤنث آیا ہے۔ [من بعد ذلك] میں جار مجرور "من بعدِ" = بعدَ ہے یعنی یہ ظرف مضاف ہے اور "ذلك" اس کا مضاف الیہ ہے۔ اردو جملے کی ترکیب میں چونکہ پہلے ظرف پھر فاعل اور فعل آخر پر آتا ہے اس لیے اس کا سلیس ترجمہ "پھر اس کے بعد (بھی) تمہارے دل سخت ہو گئے / رہے" سے کیا گیا ہے۔ تراجم حصۂ "اللغۃ" میں دیکھئے۔

(۲) فھی کالحجارۃ او اشدّ قسْوۃً:

[فَ] عاطفہ اور [ھِیَ] مبتدأ ہے جو ضمیر مرفوع منفصل ہے اور مؤنث ضمیر "قلوب" (جمع مکسر) کے لیے آئی ہے [کالحجارۃ] میں "كَ" (بمعنی "مانند") حرف الجر ہے اور "الحجارۃ" اس کی وجہ سے مجرور ہے علامتِ جر آخری "ۃ" کی کسرہ (ـِـ) ہے یہ مرکب جاری یہاں مبتدأ (ھی) کے ساتھ خبر کا کام دے رہا ہے لہذا اسے محلاً مرفوع کہہ سکتے ہیں اور بعض حضرات اسے قائم مقام خبر بھی کہتے ہیں کیونکہ اصل خبر (کائنۃٌ: ہونے والا وغیرہ) محذوف ہے۔ [اَوْ] حرفِ عطف (بمعنی "یا") بھی ہو سکتا ہے جس میں ابہام کا مفہوم ہے تاہم سیاقِ عبارت کا تقاضا ہے کہ یہاں "اَوْ" حرفِ اضراب (بَلْ) کے معنی (بلکہ) میں لیا جائے [اَشَدُّ] افعل التفضیل ہے جو نحوی اعتبار سے "كَ" (بمعنی "مثل") پر عطف ہونے کے باعث مرفوع ہے یعنی یہ رفع بلحاظ معنی ہے یا یوں سمجھئے کہ یہ (اشد) یہاں ایک محذوف (مکرر) مبتدأ (ھی) کی خبر مرفوع ہے یعنی "ھِیَ اشدُّ" علامتِ رفع "دّ" کا ضمہ (ـُـ) ہے۔ اور یہاں "اشدّ" کے بعد اس کا مفعول (جس پر فضیلت ہو یا جس سے بڑھ کر ہو کسی بات میں) جس سے پہلے عموماً "من" لگتا ہے وہ بھی محذوف ہے یعنی "منھا" (پتھروں کے لیے مؤنث ضمیر)۔ اس طرح محذوفات سمیت تقدیر (اصل مقصود و مفہوم) عبارت کچھ یوں بنتی ہے "او (ھی) اشد (منھا)" یعنی "بلکہ وہ ہے زیادہ سخت ان سے" "ھا" کا ترجمہ "پتھروں کی وجہ سے" "ان" کیا گیا ہے [قسوۃً] افعل التفضیل "اشدّ" کی تمیز (لھذا) منصوب ہے علامت نصب تنوین نصب (ـً) ہے۔ جس کا اردو ترجمہ

"بلحاظ سختی کے" یا "سختی میں" ہی کیا جاسکتا ہے۔ یوں اس حصہ عبارت (او اشد قَسْوَةً) کا ترجمہ بنتا ہے "بلکہ زیادہ سخت بلحاظ سختی کے"۔ پھر "شِدّة" اور "قسوة" کی سختی میں فرق کرنے کے لیے (دیکھئے حصہ "اللغة") نیز محذوفات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مقدّر (understood) عبارت اور (هی) اشد (منها) قسوةً" کے ساتھ بامحاورہ ترجمہ کرنے اور "سخت اور سختی" کی تکرار سے بچنے کے لیے بعض مترجمین نے اس (او اشد قسوة) کا ترجمہ "بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت/ان سے بھی سخت/ان سے بھی سخت تر/ان سے بھی زیادہ کڑے/سختی میں ان سے بھی بڑھ کر" کی صورت میں کیا ہے۔ ان سب ترجموں میں "ان سے" اسی محذوف (مگر مفہوم) "منها" کا ترجمہ ہے۔ بعض نے "سختی میں (پتھر سے بھی) زیادہ سخت" ترجمہ کیا ہے اس میں ضمیر کی بجائے اسم ظاہر یعنی "منها" کی بجائے "من الحجارة" کو ہی مقدر سمجھ کر ترجمہ کیا گیا ہے۔ بعض نے "اس سے بھی زیادہ" یعنی بصورت واحد ترجمہ کیا ہے جو سیاق عبارت اور نص (عبارت) سے ذرا ہٹ کر ہے۔

● یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں فعل مجرد (قسا یقسو = سخت ہونا) سے صیغہ افعل التفضیل استعمال ہوسکتا تھا یعنی "او اَقسٰی منها" کی شکل میں۔ "اشدّ" (وغیرہ) کا استعمال تو مزید فیہ سے افعل التفضیل بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ تاہم یہاں معنی میں سختی (قسوة) کی بھی شدت کا مفہوم پیدا کرنے کے لیے "اَوْ اَقْسٰی" کی بجائے "او اشدّ قَسْوَةً" لایا گیا ہے نیز دیکھئے حصہ "اللغة" میں "شدّة" اور "قسوة" (ہر دو بمعنی سختی) میں فرق کا بیان۔

(۳) وان من الحجارة لما یتفجر منه الانهر۔

[وَ] یہاں حالیہ بھی ہوسکتی ہے اور مستانفہ بھی [اِنَّ] حرف مشبہ بالفعل ہے۔ اس کا اسم (منصوب) آگے آرہا ہے۔ [من الحجارة] جار مجرور "اِنَّ" کی قائم مقام خبر یا متعلق خبر مقدم (اپنی جگہ سے پہلے آگیا) ہے اور [لَمَا] میں لام (لَ) تو لام مزحلقہ ہے (یہ لام الابتداء ہی ہوتا ہے جو کسی اسم (مبتدأ یا خبر) یا فعل مضارع پر تاکید کے لیے لگتا ہے۔ مگر جب یہ "اِنَّ" والے جملے کے اسم یا خبر پر آتے تو اسے لام مزحلقہ کہتے ہیں) اس سے مقصود تاکید ہی ہوتی ہے اور "ما" موصولہ یہاں "اِنَّ" کا اسم، لہٰذا محلاً منصوب، ہے گویا عبارت کچھ یوں تھی "وَاِنَّ مِنَ الحجارةِ لَحَجَرًا" (اور بے شک پتھروں میں سے کوئی پتھر ہوتا ہے جو کہ)۔ [یتفجّرُ] فعل مضارع مع ضمیر الفاعل (هو) ہے۔ یہ "ما" موصولہ کا صلہ ہے یعنی یہاں سے صلہ شروع ہوتا ہے جو جملے کے آخر تک چلتا ہے۔ [منه] جار مجرور متعلق فعل (یتفجّرُ) ہیں۔ اس میں ضمیر مذکر (ہ) ایک یا کوئی پتھر کے لحاظ سے آئی ہے۔ [الانهارُ]

فعل "یتفجّرُ" کا فاعل (لہٰذا) مرفوع ہے۔ علامتِ رفع آخری "ر" کا ضمہ (ـُ) ہے۔ یہاں صیغۂ فعل (جمع مکسر "الانہار" کے فاعل ہونے کی بناء پر) بظاہر مؤنث (تتفجر) ہونا چاہیے تھا تاہم صیغۂ فعل کو واحد مؤنث یا مذکر ہی لانا صرف اس صورت میں واجب ہوتا ہے جبکہ فاعل واحد مذکر یا واحد مؤنث حقیقی ہو۔ جمع مکسر یا مؤنث سماعی وغیرہ میں مذکر مؤنث دونوں صیغۂ فعل استعمال ہو سکتے ہیں مثلاً "کتبتِ المرأۃُ" یا "کتبَ الرجلُ" کہنا ضروری ہے مگر "کتبَ النساءُ" یا "کتبتِ الرجالُ" کہہ سکتے ہیں "یتفجر" کے اردو ترجمہ میں فعل کی تذکیر یا تانیث "الانہار" کے ترجمہ کے مطابق ہو گی۔ مثلاً "دریا نکلتے ہیں" یا "ندیاں نکلتی ہیں" وغیرہ۔

④ وان منہا لما یشّقق فیخرُج منہ الماءُ

[وَ] عاطفہ ہے جو اس جملے کو سابقہ جملے سے ملاتی ہے۔ [انّ] حرف مشبہ بالفعل اور [منہا] جار مجرور مل کر اس (اِنّ) کی خبر یا قائم مقام خبر مقدم (پہلے آگئی) ہے۔ ضمیر مؤنث "ھا" الحجارۃ (جمع مکسر) کے لیے ہے۔ [لَمَا] یہاں بھی سابقہ جملے کی طرح (لَ) لامِ مزحلقہ ہے اور "مَا" اسم موصول اِنّ کا اسم مؤخر (جو بعد میں آیا) ہے۔ [یشّقق] فعل مضارع مع ضمیر الفاعل (ھو) ہے اور یہ صیغۂ فعل ایک جملہ فعلیہ ہے جو "ما" کا صلہ ہے۔ صیغۂ فعل کی تذکیر بلحاظ معنیٰ "کسی ایک پتھر" کے لیے ہے [فیخرُج] میں فاء (ف) عطف کے لیے ہے اور فعل "یخرُج" بھی مضارع صیغہ واحد مذکر غائب ہے جس کا عطف بذریعہ "فَ" سابقہ فعل "یشّقق" پر ہے [منہ] جار مجرور متعلق فعل (یخرج) ہیں اور یہ ضمیر (ہ) بھی بلحاظ معنیٰ "ایک پتھر" کے لیے ہے [الماءُ] فعل "یخرج" کا فاعل (لہٰذا) مرفوع ہے علامتِ رفع آخری "ء" کا ضمہ (ـُ) ہے۔

⑤ وانّ منہا لَمَا یھبط من خشیۃ اللہ۔

[وانّ منہا لَمَا] کا اعراب و ترکیب اوپر والے جملے (کے ابتدائی حصے) کی طرح ہے [یھبط] فعل مضارع مع ضمیر الفاعل (ھو) ہے اور فعل کی تذکیر معنیٰ کے لحاظ سے "کسی ایک پتھر" کے لیے ہے (وہ گرتا ہے) اور یہاں بھی "یھبط" سے "ما" کا صلہ شروع ہوتا ہے (جو آخر عبارت تک کا جملہ ہے) [من خشیۃ اللہ] میں "مِنْ" تو حرف الجر ہے "خشیۃ" مجرور بالجر بھی ہے اور آگے مضاف بھی ہے اس لیے خفیف بھی ہے "اللہ" مضاف الیہ (لہٰذا مجرور بالاضافہ) ہے۔ یہ سارا مرکب جاری (من خشیۃ اللہ) فعل "یھبط" سے متعلق ہے جو ہبوط (گرنے) کی وجہ (تعلیل) بیان کرتا ہے یعنی یہاں "من" کا مطلب "کی وجہ سے" ہے۔

⑥ وما اللہ بغافل عما تعملون

[وَ] برائے استیناف ہے یعنی یہاں سابقہ مضمون سے الگ ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ [مَا] حجازیہ (نافیہ) ہے جو "لَیْسَ" کا سا عمل کرتی ہے۔ [اللّٰہُ] اس (مَا) کا اسم (لہٰذا) مرفوع ہے [بِغَافِلٍ] کی با (ب) زائد حرف الجر ہے جو "لیس" (اور اس کے ساتھی حروف) کی خبر پر تاکید کے لیے آتی ہے۔ "غافلٍ" بوجہ با (ب) مجرور ہے اس طرح یہ لفظاً تو یہاں مجرور ہے مگر "مَا" کی خبر ہونے کے لحاظ سے محلاً منصوب ہے (لَیْسَ کی خبر پر "ب" نہ ہو تو منصوب ہوتی ہے) [عَمَّا] جار (عن) اور مجرور (مَا) ہے جس میں "ما" موصولہ ہے اور [تَعْمَلُونَ] فعل مضارع مع ضمیر الفاعلین (انتم) جملہ فعلیہ ہو کر "مَا" کا صلہ ہے۔ یہاں "مَا" کی عائد ضمیر محذوف ہے یعنی دراصل تھا "عما تعملونہ" یہ سارا صلہ موصول "ما تعملون" "عن" کی وجہ سے محلاً مجرور ہے اور خبر "بغافل" سے متعلق ہے۔

۲:۴۶:۳ الرسم

بلحاظ رسم زیر مطالعہ آیت میں صرف چار کلمات توجہ طلب ہیں یعنی "ذلك، الانهر، بغافلٍ، عَمَّا"۔ ان میں سے تین کا رسم متفق علیہ ہے۔ صرف ایک کا مختلف فیہ ہے تفصیل یوں ہے:۔

① "ذلك" کے رسم پر [۲: ۲: ۳] میں بات ہوئی تھی۔ یہ لفظ صرف رسم عثمانی میں ہی نہیں بلکہ رسم املائی میں بھی "ذ" کے بعد الف کے حذف سے لکھا جاتا ہے۔

② "الانهر" جس کا رسم املائی "الانهار" ہے۔ رسم قرآنی میں ہر جگہ "بحذف الالف بعد الہاء" لکھا جاتا ہے یعنی "الانهر" کی شکل میں اور یہ اس کا متفق علیہ رسم ہے یعنی سب علمائے رسم کا اس پر اتفاق ہے۔

③ "بغافلٍ" الدانی کے اصول پر (کہ "فاعل" کے وزن پر آنے والے مفرد (بصیغۂ واحد) کلمات اثبات الف کے ساتھ لکھے جاتے ہیں) یہ لفظ "باثبات الالف بعد الغین" لکھا جاتا ہے برصغیر، ترکی، ایران اور لیبیا کے مصاحف میں یہ اسی طرح (باثبات الف) لکھا جاتا ہے۔ تاہم ابو داؤد کی طرف منسوب قول کی بنا پر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں اسے بحذف الالف بعد الغین یعنی "بغفل" کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔

④ "عَمَّا" جو دراصل "عن ما" ہے قرآن کریم میں ہر جگہ "عَمَّا" یعنی موصول (ملا کر) ہی لکھا جاتا ہے البتہ صرف ایک جگہ (الاعراف: ۱۶۶) یہ مقطوع بصورت "عن ما" لکھا جاتا ہے۔

۲:۴۶:۴ الضبط

زیر مطالعہ عبارت کے کلمات میں ضبط کا تنوع درج ذیل مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ثُمَّ، ثُمَّ/ قَسَتْ، قَسَتْ/ قُلُوبُكُمْ، قُلُوبُكُمْ، قُلُوبَكُمْ/
مِنْ بَعْدِ، مِنْ بَعْدِ، مِنْ بَعْدِ، مِنْ بَعْدِ/ ذٰلِكَ، ذَالِكَ، ذٰلِكَ/
فَهِيَ، فَهِيَ/ كَالْحِجَارَةِ، كَالْحِجَارَةِ، كَالْحِجَارَةِ/ اَوْ، أَوْ، أَوْ/
اَشَدُّ، أَشَدُّ، أَشَدُّ/ قَسْوَةً، قَسْوَةً/ وَاِنَّ، إِنَّ، اِنَّ/ مِنَ الْحِجَارَةِ،
مِنَ الْحِجَارَةِ، مِنَ الْحِجَارَةِ/ لَمَا، لَمَا، لَمَا/ يَتَفَجَّرُ، يَتَفَجَّرُ/
مِنْهُ، مِنْهُ/ الْاَنْهٰرُ، الْأَنْهَرُ، الْاَنْهٰرُ/ وَاِنَّ، إِنَّ، اِنَّ/ مِنْهَا،
مِنْهَا/ لَمَا (مثل سابق)/ يَشَّقَّقُ، يَتَشَقَّقُ/ فَيَخْرُجُ، فَيَخْرُجُ/ مِنْهُ،
مِنْهُ/ الْمَآءُ، الْمَآءُ، الْمَآءُ/ وَاِنَّ، إِنَّ، اِنَّ/ مِنْهَا، مِنْهَا/ لَمَا
(مثل سابق)/ يَهْبِطُ، يَهْبِطُ/ مِنْ، مِنْ/ خَشْيَةِ، خَشْيَةِ/
اللّٰهِ، اللّٰهِ، اللّٰهِ/ وَمَا اللّٰهُ، اللّٰهُ، اللّٰهُ/ بِغَافِلٍ، بِغَافِلٍ،
بِغَفِلٍ، بِغَفِلٍ/ عَمَّا، عَمَّا، عَمَّا/ تَعْمَلُوْنَ، تَعْمَلُوْنَ،
تَعْمَلُوْنَ۔

عَنِ ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما قال: قال رَسُوْلُ اللّٰہ ﷺ:

((اِنَّ الرَّجُلَ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِهٖ
مِنَ الْقُرْآنِ شَیْءٌ كَالْبَیْتِ الْخَرِبِ))

رواہ احمد والترمذی' وقال: حسنٌ صحیحٌ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
"جس شخص کے سینے میں قرآن میں سے کچھ بھی محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کی مانند ہے۔"

قرآن کالج لاہور ___ ایک تعارف

___ پروفیسر احمد شفیع چودھری' پرنسپل قرآن کالج ___

امسال ایف اے کے داخلوں کے موقع پر قرآن کالج لاہور اور اس کے کورسز کی تشہیر و تعارف کے لئے قرآن آڈیٹوریم میں ایک تعارفی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس اجتماع میں قرآن کالج کے پرنسپل جناب احمد شفیع صاحب نے نہایت جامع انداز میں کالج کا تعارف کرایا جسے ہدیہ قارئین کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

قرآن کالج دراصل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس کالج کے ذریعے اس تحریک کے مقاصد حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اس عمارت میں اس کالج کا اجرا چھ سال قبل عمل میں آیا۔ اور اب یہ کالج بین الصوبائی حیثیت اختیار کر چکا ہے' کیونکہ پاکستان کے ہر صوبے اور علاقے کے طلباء یہاں داخلہ لیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بلوچستان' سرحد' سندھ' پنجاب' قبائلی علاقے' شمالی علاقے' سوات اور آزاد کشمیر کے طلباء زیر تعلیم رہتے ہیں۔

یہ کالج دینی و دنیوی تعلیم کے حسین امتزاج کا مرقع ہے۔ ایک جانب تو یہاں عربی گرائمر یعنی صرف و نحو کی بھرپور تدریس کا اہتمام کیا جاتا ہے' طلباء میں اتنی استعداد پیدا کی جاتی ہے کہ وہ قرآن حکیم کو تراجم کے بغیر سمجھ سکیں' اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے تجویز کردہ "قرآن حکیم کے منتخب نصاب" کا تفصیلی درس دیا جاتا ہے' نیز قرآن کے تجوید و حفظ کے علاوہ فقہ اور حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور قرآن مجید کے کچھ حصے کے ترجمے اور تفسیر سے روشناس کرایا جاتا ہے' اور دوسری جانب بورڈ اور یونیورسٹی کے مقرر کردہ نصاب کے عین مطابق ایف اے اور بی اے کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لازمی مضامین کے علاوہ یہاں دوسرے کالجوں کی طرح آرٹس میں کئی انتخابی مضامین کا Choice موجود ہے۔ چنانچہ ایف اے کی سطح پر یہ انتخابی مضامین پیش کئے گئے ہیں : عربی' معاشیات'

سوکس 'فلسفہ' ریاضی' تاریخ اور اسلامیات۔

قرآن کالج میں' اس کے نام کی مناسبت سے' عربی کی تدریس لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ہر طالب علم ان انتخابی مضامین میں سے کوئی سے دو مضامین کا انتخاب کر سکتا ہے۔ بعینہٖ بی اے میں بھی انتخابی مضامین کا Choice دیا گیا ہے۔

کالج میں طلباء کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک انتہائی سازگار ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔ یہاں کے اکثر طلباء ہاسٹل میں رہائش پذیر ہیں' جہاں ان کی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ انہیں نماز باجماعت کا پابند بنایا جاتا ہے۔ فجر کی نماز کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور طلباء کو بروقت بیدار کر کے نماز کی سختی سے پابندی کرائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان طلباء میں دینی شعور اجاگر کرنے کے لئے ہفتے میں تین دن تذکیری اجتماع منعقد کئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ ہاسٹل میں ایسی فضا قائم کی جاتی ہے جس سے طلباء میں اسلام سے وابستگی اور قرآن مجید کے ساتھ ان کے تعلق کو فروغ ملتا ہے۔ اگر آپ کو کبھی صبح کے وقت ہاسٹل آنے کا اتفاق ہو تو آپ کو ہاسٹل کے کمروں سے تلاوت قرآن کی روح پرور گونج سنائی دے گی اور سارا ماحول آپ کو اس آواز کی حلاوت سے سرشار نظر آئے گا۔

ہاسٹل کے طلباء کو بے مہار گھومنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ یہاں بھی تعلیمی فضا برقرار رکھی جاتی ہے۔ شام کے وقت انہیں ہوم ورک کرنے کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ وہ کالج کے پرسکون ماحول میں مختلف کمروں میں جمع ہوتے ہیں جہاں سٹاف کا کوئی رکن موجود ہوتا ہے جو ان کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کی تعلیمی مشکلات دور کرتا ہے۔ یہاں طلباء کے لئے لائبریری کی سہولت بھی موجود ہے۔

سٹاف : کالج کے سٹاف میں کوالیفائڈ اور تجربہ کار اساتذہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض کالجوں سے ریٹائرڈ پروفیسر ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی درس و تدریس میں صرف کی۔ یہ تمام اساتذہ کالج کے اوقات میں پوری لگن' تندہی اور باقاعدگی سے طلباء کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ طلباء کو محنت کا عادی بنایا جاتا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے ساتھ جان کھپائی جاتی ہے اور ان کی استعداد کار میں قابل قدر اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں ان کارکردگی کسی بھی اچھے

کالج سے کمتر نہیں ہوتی۔

کارکردگی : آپ کو شاید یہ بات معلوم نہ ہو کہ اب تک ہمارے ہاں جو طلباء داخلہ لیتے ہیں' ان میں سے اکثر کی کارکردگی میٹرک کے امتحان میں اتنی اچھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے عموماً Low سیکنڈ ڈویژن یا تھرڈ ڈویژن میں امتحان پاس کیا ہوتا ہے' لیکن یہاں کے سازگار تعلیمی ماحول میں رہ کر وہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں اور بہت بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

یہاں میں پچھلے سال کے ایف اے کے نتائج کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں (کیونکہ اس سال کے نتائج کا ابھی انتظار ہے) کالج کا نتیجہ تقریباً ۹۰ فیصد تھا۔ کامیاب ہونے والے لڑکوں میں سے چند یہ ہیں :

نام	میٹرک میں نمبر	فیصد	ایف اے میں نمبر	فیصد
1 ۔ خالد جہانگیر	416	%49.76	713	%65
2 ۔ محبوب الحق	477	%56	717	%65
3 ۔ محمد ذکاء	423	%49.76	723	%67.54
4 ۔ محمد آصف	533	%62	748	%68

یہاں ایک بات نوٹ کرلیں کہ ان نمبروں میں عربی مضمون کا حصہ نمایاں ہے۔ یہاں اکثر طلباء جب داخلہ لیتے ہیں تو وہ عموماً عربی سے نابلد ہوتے ہیں۔ یہاں آکر وہ الف' با سے شروع کرتے ہیں اور اپنے آپ کو امتحان میں بہترین کارکردگی کا اہل بنا لیتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ جن طلباء کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ان میں سے پہلے طالب علم نے عربی کے مضمون میں ۲۰۰ نمبروں میں سے بورڈ کے امتحان میں ۱۶۴ نمبر حاصل کئے' دوسرے نے ۱۶۹ نمبر' تیسرے نے ۱۷۷ نمبر اور چوتھے نے ۲۰۰ میں سے ۱۸۸ نمبر حاصل کئے۔ یعنی کل نمبروں میں سے صرف بارہ کم۔

طلبہ کا مستقبل : ہم سے اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ اس کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمارے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ نتائج سامنے رکھتے ہوئے آپ میرے ساتھ یقیناً اتفاق کریں گے کہ جو طلباء اتنی استعداد حاصل کرلیتے ہیں وہ زندگی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے

نہیں رہ سکتے' بلکہ دوسروں پر سبقت حاصل کرنے کے لئے پر عزم نظر آتے ہیں۔ ایسی صلاحیتوں کے حامل طلباء جب یہاں سے بی اے کرکے اپنی صلاحیتوں کو مزید صیقل کریں گے تو کون ہے جو ان کی کسی بھی اچھے ادارے میں پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم حاصل کرنے میں سدِ راہ ہو۔ وہ M.B.A., M.P.A., M.Ed., M.A., L.L.B میں سے کسی بھی کورس میں داخلہ لے کر اپنے مستقبل کو درخشاں بنا سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں اگر وہ C.S.S، P.C.S یا کسی بھی Competition میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیں تو ان کی کارکردگی ان شاء اللہ نمایاں ہوگی اور عربی زبان ان کی بھرپور مدد کرے گی۔ اور اگر وہ Math کو بھی بطور انتخابی مضمون اختیار کرلیں (جو یہاں بطور انتخابی مضمون پڑھایا جاتا ہے) تو ان کی کامیابی کا دائرہ اور وسیع ہوگا' کیونکہ Math میں بھی نمبر زیادہ آتے ہیں اور ہمارے ہاں اس وقت ایک بہت ہی تجربہ کار استاد' پروفیسر ڈاکٹر شاہ مبین الحق کی شخصیت موجود ہے' جنہوں نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں تقریباً ۳۰ سال Math کی تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ ان سب مواقع کے ہوتے ہوئے جن کا میں نے ذکر کیا ہے میرے نزدیک سب سے افضل بات تو یہ ہے کہ اس کالج کے فارغ التحصیل طلباء اپنی عملی زندگی میں قرآن کے معلم اور مبلغ بن کر ملت اسلامیہ کی راہنمائی کے فرض سے عہدہ برآ ہوں۔ اور وہ یہ فرض زیادہ احسن طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔

ہم نصابی سرگرمیاں : کالج میں ہم صرف نصابی تعلیم پر ہی زور نہیں دیتے بلکہ طلباء کے لئے ہم نصابی سرگرمیوں کا بھی خاطر خواہ اہتمام کرتے ہیں تاکہ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ چنانچہ صرف ایک تعلیمی سال کے دوران میں یہاں کم و بیش دس انعامی مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں جن میں قرآن حکیم' سیرت النبی ﷺ کے کسی پہلو پر تقاریر' مضمون نویسی' حسن قراءت' ذہنی آزمائش اور دیگر موضوعات پر مقابلے شامل ہیں۔ نیز جو طلباء ان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرکے اپنے آپ کو انعام کا اہل ثابت کرتے ہیں انہیں سال کے آخر میں ایک خاص تقریب میں انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ طلباء ان مقابلوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ انکی تعداد بڑی حوصلہ افزا ہوتی ہے اور ہر مقابلہ میں ان کی تعداد پچیس یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور ہمارے جیسے چھوٹے کالج میں

اتنی تعداد میں طلباء کا کسی ایسے مقابلے میں شریک ہونا یقیناً ایک خوش آئند تصور ہے۔

ان ہم نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے طلباء کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو جلا ملتی ہے' ان میں تحریر و تقریر کا ملکہ پیدا ہوتا ہے' جنرل نالج میں اضافہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دوسروں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پروان چڑھتا ہے۔

یہاں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ پچھلے سال ادارہ منہاج القرآن نے ایک آل پاکستان بین الکلیاتی مضمون نویسی کا مقابلہ منعقد کروایا۔ ہمارے طلبہ نے بھی اس میں حصہ لیا اور ہمارے ایف اے کے ایک طالب علم نے وہاں پہلی پوزیشن حاصل کر کے اپنے آپ کو انعام کا اہل ثابت کیا اور اپنے کالج کا نام روشن کیا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نظم و ضبط : قرآن کالج میں نظم و ضبط کی حالت خاصی تسلی بخش ہے۔ کالج کے اوقات کار کے دوران تمام طلباء اپنی کلاسیں باقاعدگی سے اٹینڈ کرتے ہیں۔ جب کلاس میں ٹیچر موجود ہو تو آپ کو کوئی لڑکا کاریڈور میں یا باہر گھومتا نظر نہیں آئے گا' سب طلباء اپنی پڑھائی میں مشغول ہوں گے۔ وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے صرف وقفے کے دوران ہی اپنے ٹیوٹر یا متعلقہ اہلکار سے مل سکتے ہیں۔ اس طرح کالج میں صحیح تعلیمی ماحول پایا جاتا ہے اور یہاں شور شرابے یا بے مقصد گھومنے پھرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاتی۔

آخر میں کچھ ایک سالہ کورس کے بارے میں ذکر کروں گا۔ یہاں کالج میں ایف اے اور بی اے کی کلاسوں کے علاوہ رجوع الی القرآن کی تحریک کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک سالہ کورس کا بھی انعقاد کیا گیا ہے۔ یہ کورس دو سمسٹروں پر مشتمل ہے۔ اس میں داخلہ کے لئے ان امیدواروں کو ترجیح دی جاتی ہے جو گریجویٹ ہوں اور وہ قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وقت نکال سکیں۔ الحمدللہ اس کورس کو بڑی پذیرائی حاصل ہے۔ اس کورس میں عربی گرائمر' ترجمۃ القرآن' حدیث' فقہ اور تجوید کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ○○

پیش رفت

قرآن کالج لاہور میں ایف اے کے نئے داخلوں اور اسلامک جنرل نالج ورکشاپ کی مختصر رپورٹ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے پیش نظر تعلیم و تعلّم قرآن کی جو مختلف اسکیمیں ہیں' ان میں قرآن کالج کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ امسال ایف اے سال اول میں ۴۴ طلبہ نے داخلہ لیا ہے۔ یہ تعداد بحمداللہ خاصی حوصلہ افزا ہے۔ ان ۴۴ میں سے ۵ طلبہ نے میٹرک کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی تھی جبکہ ۲۳ طلبہ کو سیکنڈ ڈویژن میں کامیابی ملی۔ بقیہ طلبہ یا تو ابھی تک رزلٹ کے انتظار میں ہیں یا پھر وہ ہیں کہ جنہوں نے تھرڈ ڈویژن میں میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کالج کے حصے میں جو طلبہ آئے ہیں ان کے سابقہ تعلیمی ریکارڈ کو قطعاً شاندار قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ لاہور کے دیگر کالجوں کے مقابلے میں یہ معاملہ اوسط معیار سے بہت کم ہے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر سال ہمارے کالج میں داخلوں کی صورتحال کم وبیش ایسی ہی رہتی ہے کہ ایک دو کے سوا باقی تمام طلبہ سیکنڈ ڈویژن یا تھرڈ ڈویژن کی کیٹیگری سے ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ قرآن کالج کے ایف اے کا رزلٹ لاہور کے دیگر کالجوں کے مقابلے میں بالعموم بہت بہتر ہوتا ہے۔ گزشتہ سال ایف اے کے بورڈ کے امتحان میں قرآن کالج کے طلبہ کی کامیابی کا تناسب ۸۹% تھا۔ ہمارا نہیں خیال کہ لاہور کے چوٹی کے کالجوں میں سے کسی کا رزلٹ اس کے آس پاس بھی ہو۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ بحمداللہ قرآن کالج میں پڑھائی کے لئے ماحول بہت سازگار ہے' یہاں تدریس بہت باقاعدگی کے ساتھ ہوتی ہے' چھٹیاں بہت کم ہوتی ہیں' اساتذہ خود بھی محنت کرتے ہیں اور طلبہ سے بھی محنت کراتے ہیں۔

نئے داخلہ لینے والے ۴۴ طلبہ میں سے ۲۸ ہاسٹل میں اقامت گزیں ہوئے ہیں کہ ان کا تعلق پاکستان کے دیگر شہروں سے ہے' جبکہ ۱۶ طلبہ نے ڈے سکالر کے طور پر کالج میں داخلہ لیا ہے۔ ان ۴۴ میں سے قریباً نصف تعداد ان طلبہ کی ہے جنہیں ان کے گھریلو حالات اور معاشی صورتحال کے پیش نظر کالج کی ٹیوشن فیس یا ہاسٹل کے اخراجات میں جزوی یا کلی رعایت دی گئی ہے۔ بقیہ نصف کا داخلہ مکمل واجبات کی ادائیگی کی بنیاد پر ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

میٹرک اور انٹر کے امتحانات سے فارغ طلبہ کے لئے امسال بھی قرآن کالج میں' حسب روایت' ۸ ہفتے کے ایک مختصر دینی و معلوماتی کورس کا انعقاد ہوا۔ اس کورس میں داخلہ اگرچہ ۳۸ طلبہ نے لیا تھا لیکن ۱۲ طلبہ بالکل آغاز ہی میں اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر اس کورس کو چھوڑ گئے۔ باقی ۲۶ طلبہ میں سے ۱۶ طلبہ اختتام تک باقاعدگی سے شریک ہوئے اور سند کے مستحق قرار پائے۔

اس ورکشاپ میں جو مضامین طلبہ کو پڑھائے گئے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے :

۱ ۔ نماز و قراءتِ قرآن کی تصحیح

۲ ۔ ارکان اسلام سے متعلق تفصیلات بذریعہ لیکچرز

۳ ۔ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے ابتدائی ۳ حصے مکمل' اور چوتھے حصے کے ابتدائی اسباق

۴ ۔ مطالعہ لٹریچر کے ضمن میں محترم ڈاکٹر اسرار صاحب کی کچھ کتب کا مطالعہ کروایا گیا۔

۵ ۔ عربی گرامر کہ جس میں صرف اسم سے متعلق ابتدائی مباحث شاملِ نصاب تھے۔

☆ ☆ ☆

قرآن اکیڈمی کراچی میں تقریب تقسیمِ اسناد

مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۹۵ء بروز جمعرات بعد نماز عصر قرآن اکیڈمی کراچی میں "تقریب تقسیم اسناد" منعقد ہوئی۔ اس سادہ اور مبارک تقریب میں ان طلباء و طالبات کو اسناد دی گئیں جنہوں نے انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک سالہ اور دو ماہی کورسز میں کامیابی حاصل کی تھی۔

ایک سالہ کورس منعقدہ ۹۴۔۱۹۹۳ء اور ۹۵۔۱۹۹۴ء اور دو ماہی کورس منعقدہ مئی تا جولائی ۹۵ء میں مجموعی طور پر ۵۷ طلباء و طالبات نے کامیابی حاصل کی۔ ان میں ۳۳ طلباء اور ۲۴ طالبات شامل تھیں۔ محترم جناب چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب نے اپنے دست مبارک سے طلباء میں اسناد تقسیم کیں' جبکہ قرآن اکیڈمی کراچی کے شعبہ خواتین کی ناظمہ صاحبہ نے طالبات میں اسناد تقسیم کیں۔ طلباء اور طالبات کے لئے یہ تقریبات ایک ہی وقت میں علیحدہ علیحدہ منعقد کی گئیں۔

طلباء میں تقسیم اسناد کی تقریب کا آغاز ذیشان عقیلی صاحب نے سورۃ الواقعہ کے آخری رکوع کی تلاوت و ترجمہ سے کیا۔ بعد ازاں' صدر انجمن خدام القرآن سندھ جناب زین

العابدین صاحب نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے انجمن خدام القرآن سندھ کے مقاصد اور کارکردگی کا جائزہ پیش کیا۔ انہوں نے کامیاب ہونے والے طلباء کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ "عربی زبان کے فہم میں پختگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تدریس نہ کی جائے اور قرآن حکیم کی اصل ہدایت تبھی منکشف ہوتی ہے جب قرآن کے مطالب کو آگے بیان کیا جائے۔"

صدر انجمن کے افتتاحی کلمات کے بعد جناب چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب نے طلباء میں اسناد تقسیم کیں۔ بعد ازاں' اپنے صدارتی خطبہ میں بٹر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ قرآن حکیم انسان کو "علم" کی بنیاد پر ہی اشرف المخلوقات قرار دیتا ہے۔ اور انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے نظریات و تصورات کی بنیاد ٹھوس علمی حقائق پر رکھے۔ علم کے حصول کے لئے جو صلاحیتیں اللہ نے انسان کو دی ہیں ان کے بارے میں روزِ قیامت باز پرس ہوگی' لہٰذا ان کا درست استعمال ضروری ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۷۹ میں جنوں اور انسانوں کی اکثریت کے جہنم میں جانے کی اصل وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی سماعت' بصارت اور قلب کو حصول علم اور غور و فکر کے لئے استعمال نہ کرتے تھے۔ علم کی دو بڑی بڑی اقسام ہیں یعنی علم الادیان اور علم الابدان۔ انسان آج علم الابدان کے حصول میں تو بہت آگے بڑھ گیا ہے لیکن علم الادیان کے حصول کی طرف اس کی توجہ بہت کم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم علم الادیان اور خاص طور پر اس کی اہم ترین شاخ علم القرآن کے حصول کی اہمیت اجاگر کریں۔ یہی علم اللہ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر ہے (سورۃ الرحمٰن آیات ۱ تا ۴) اور اس کے بغیر ہر علم بجائے مفید ہونے کے مضر ہے۔

چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب نے کئی احادیث مبارکہ کے حوالے سے ان لوگوں کی عظمت و فضیلت کا ذکر کیا جو قرآن حکیم کا علم سیکھتے ہیں' اس پر عمل کرتے ہیں اور اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ چودھری صاحب نے اپنے خطبہ کے اختتام پر حاضرین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا سنائی جس میں آپؐ نے بڑی عاجزی اور انکساری کے اظہار کے بعد اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے کہ "اے اللہ قرآن کو ہمارے دلوں کی بہار' ہمارے سینوں کا نور' ہمارے دکھوں کا مداوا اور ہمارے اندیشوں اور غموں کو دور کرنے والا بنا دے"۔

راقم الحروف (ناظم تدریس) نے اختتامی کلمات کے طور پر کامیاب ہونے والے طلباء کو مبارکباد دی اور کہا کہ آپ نے قرآن حکیم کے سیکھنے کے عمل کی ایک سند تو یہاں حاصل کر لی ہے لیکن اصل خواہش یہ ہونی چاہئے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ ہمیں ان بہترین لوگوں میں شمولیت کی سند عطا فرما دے جو حدیث نبوی کے مطابق قرآن حکیم کے سیکھنے اور سکھانے والے ہیں۔ اس

خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ علم قرآن دوسروں کو سکھاتا ہو گا جو ہم نے خود سیکھا ہے اور اپنے علم قرآن کو مزید بڑھاتا ہو گا۔ تقریب کا اختتام چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب کی دعا پر ہوا۔

طالبات میں تقسیم اسناد کے بعد انجمن خدام القرآن سندھ کی شعبہ خواتین کی ناظمہ صاحبہ نے کامیاب طالبات کو مبارکباد پیش کی اور انہیں قرآن حکیم کی نشر و اشاعت میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ انہوں نے مسز خالد علی اور بنتِ احمد شمسی کی خاص طور پر حوصلہ افزائی فرمائی جنہوں نے ایک سالہ کورس کی تکمیل کے بعد دو ماہی کورس میں خواتین کو عربی گرامر کی تعلیم دی۔ انہوں نے اپنے خطاب میں انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے دائرہ ہائے کار اور اہداف کے فرق کو بڑی عمدگی سے واضح فرمایا۔ (مرتب : نوید احمد' کراچی)

(**Continued from page 92**)

everlasting; it summons to duty by its demands and averts from wrongdoing by its prohibitions: (*Republic*, 3 : 22)

12 It would be too lengthy to cite here all the Quranic exhortations. However, we may recall a passage (4 : 36-8) in which it speaks of the social behaviour of the devoutly God-conscious man: "And serve God; ascribe no thing as partner unto Him : (show) kindness unto parents, and unto near kindred, and orphans, and the needy, and unto the neighbour ..... and the fellow-traveller and the wayfarer and the slaves whom your right hands possess."

13 *Majum'a Tafasir-e-Farahi* (author's translation from Urdu), Lahore, 1969, P. 350.

14 *Grundlegung*, 2 ; E.T. Abbot, p. 46.

REFERENCES & FOOTNOTES

1 This fact is amply borne out by a study of contemporary Anglo-American analytical and linguistic moral writers, e.g., Ayer, Hare, Toulmin, Stevenson, and others.

2 Emil Durkheim, the eminent sociologist, introduced the term 'anomie' which looms large among his many contributions. 'Anomie' means a condition of normlessness, a moral vacuum, the suspension of normative ethical rules, a state sometimes referred to as de-regulation.

3 Cf. Quranic verses 57:27, 3:105, 4:76.

4 Iqbal:*Reconstruction of Religious Thought in islam*, Sheikh Ashraf Publisher, Lahore, p. 81.

5 Buber, Berdyaev, Paul Tillich and H.D. Lewis are some of the eminent contemporary philosophers who have written in this vein.

6 See Surah Al-Furqan verses 47-54.

7 Numerous excellent works of Jung, Erich Fromm and others amply prove this claim.

8 The parallelism between the Arabic words 'Birr' and 'Bahar' as used in Urdu also and the consequent sense of insecurity and discomfort experienced while indulging in immoral acts is supported by a great Quranic scholar, Imam Raghib. Cf.f his Mufridats, p.39.

9 The *nature* conceived by the Holy quran is governed by a primordial, universal law which is fundamentally rational.

10 Here the Quran refers to ideal human nature, i.e., the nature bestowed on humanity by God at the dawn of creation. It is not the same thing as Rousseau and some other moralists speak of in terms of 'primitive' or 'original' nature, because their view does not go beyond the spatio-temporal dimensions.

11 Cf. Cicero: "True law is right reson in agreement with nature; it is of universal application, unchanging and

love for, other human beings lose all their moral worth unless inspired by pure sense of duty and unless emptied of all desire to be benevolent towards fellow-beings. According to the Quranic view, on the other hand, neither desire as such, nor the higher desires that relate to high and noble ends, are condemned. Only the desires relating to the unregulated instinctive urges, called *hawa* in Quranic terminology, are subjected to moral disapproval.

Conclusion

In the foregoing pages I have discussed in detail the Islamic notion of ethical virtue as depicted in the two Quranic locutions—*Birr* and *Saleh*. Islam identifies virtue with good works based on religious beliefs. As such, morality is an inner quality, a property of motive or intention rather of mere consequences or outward form of one's actions. On this view, the promptings of informed reason and moral conscience represent an inherent tendency in the truly authentic nature of man, and the conformity to this nature fulfils both the cosmic plan of the Creator and the direct commands of God revealed in the Quran. The moral precepts of the Quran and scientific/psychological knowledge of the universal needs and tendencies of man, provide complementary rather than competing standards of ethical judgement. Good as fulfilment of genuine natural tendencies is subordinated to attaining God's pleasure, or to use a philosophical expression—eternal beatitude—the fulfilment of the aspirations of the virtuous soul. The notion of righteousness that is the pride possession of a Muslim is the ever-present sense of moral responsibility, an inner calling that is both intimately personal and ineluctably trans-institutional.

* * *

intellect and conscience are capable of making genuine discrimination between good and evil. Quranic theology has dealt with the problem of the concrete moral decision in terms of the doctrine of the divine presence. The sense of "Divine Presence every-where" opens man's eyes and ears to the moral demand implicit in the concrete situation. Tables of laws can never wholly apply to the unique situation. Belief in God, on the contrary, opens the mind to these potentialities and guides decision in a particular situation.

The plural nominative of 'saleh' used in the Quran is 'salehat'. It means good deeds. Its semantic constitution contains emphatic reference to belief in God, prayer, and good will and love for humanity. However, the practice of *salihat* is repeatedly joined to Faith. Thus this term connotes 'faith expressed in outward conduct'. If we take into consideration the facts of human psychology in reference to the proper realisation of the moral ideal, we are bound to hold to the Quranic view that some desires deserve to be suppressed, some to be moderated, and some to be encouraged and enhanced, ultimately subordinating all to the spiritual yearning of obtaining Divine Pleasure,—keeping the sense of duty always dynamically alive and the action entrenched in the purest motivation. In this sense, the soundness of the Quranic view is self-evident even though certain religions like Budhism, and certain great moral philosophers like Kant are opposed to it. For instance, maintaining that all desire is bad, Kant says: "The inclinations themselves being sources of want, are so far from having an absolute worth for which they should be desired, that on the contrary it must be the universal wish of every rational being to be wholly free from them".[14] Schopenhauer rightly terms Kant's view as the 'apotheosis of lovelessness', because in Kant's estimation even the most unselfish acts of benevolence towards, and

true being is gradually silenced until it reaches a state of total depersonalization, described by the Quran as the state in which:

> 'God hath set a seal on their hearts and on their hearing, and on their eyes is a veil; great is the penalty they incur'. (2 : 7)

One cannot discard the moral imperative itself without the self-destruction of one's essential nature and one's manifold relationships. Moreover, the Quranic word 'amal' too is very significant. The two locutions 'action' and 'activity' are both generally taken to convey the sense of the Arabic word 'amal'. But there is a subtle difference in their connotation. Any kind of movement or work can be called activity, but the word action usually implies some strenuous or arduous task and it, as such, better expresses the meaning of 'amal'. By combining the connotations of 'Saleh' as explained above and that of 'amal', we would realize that the real significance of this term is: it is necessary for man to put up a hard struggle to achieve that real goal for which he was potentially created, and he has to ascend certain heights to attain that goal. All this is conveyed by the comprehensive word 'amal Saleh'.

The basic and poignant concern of the Islamic faith is to point to, and overcome, the crisis of our age—the crisis of man's separation from man and of man's separation from God. Islam recognizes that human morality and human ideals thrive only when set in a context of a transcendent attitude. A religious person commands a depth of consciousness inaccessible to the profane man. The Quran emphasizes the moral dynamic of man. Its image of man as the vicegerent of God on earth, *Homo cum Deo,* implies the heightest conceivable freedom, the freedom to collaborate with the very creative process. This image implies further that the

enhancement. By means of good deeds alone man can attain those highest stages of development to which he aspires while sticking to his true and ideal nature ...... This point can be put alternatively thus: Since man is an integral part of the total scheme of universe, only those of his deeds will be righteous which accord with the grand design on which the universe has been fashioned by its Creator".[13]

These ideas can be explained philosophically thus. Man, like any other being, has environment; but in contrast to brute animals, he is not bound to it. He can transcend it, in imagination, thought and action. His encounter with any of the objects and situations surrounding him is always active and creative. Such an encounter presupposes ability to transcend and overcome both psychological inclination and outer compulsion, the ability to see the universal within the particular. The Quranic moral imperative, in this sense, is the demand to realize one's true nature actually which he has potentially. Every act is a morally good action in which an individual self establishes itself as a true person. In this way, a moral act is not an act in obedience to an externally imposed law; it is the inner law of our true being, of our essential nature. Conversely, an antimoral act is not the transgression of one or several prescribed commands, but an act that contradicts the self-realization of the person as a person and drives towards disintegration—*'fasad'* in Qur'anic usage. It disrupts and corrupts the centredness of the person by giving predominance to degenerate passions, desires and cravings. And when this happens, the self as an active being is split and the conflicting trends make it their battlefield. The 'will', in the sense of a self that acts from the centered totality of its being, is enslaved. Freedom is replaced by compulsion. The voice of man's essential and

all the passages of the Quran and the moral teachings are repeatedly stressed in various contexts throughout the Holy Book. Every Quranic moral principal is mentioned either as a single significant principle or as an element of a total system of morality, which itself is an element of a complete religious supersystem. The basic morals of the Quran are meant to help the individual to develop his personality and cultivate his character in the most wholesome manner, to strengthen his bonds and consolidate his association both with the Creator and the creatures. The Quranic ethic is not simply an abstract ideal conceived just for nominal adoration or a stagnant idol to be frequented by admirers every now and then. It represents a code of life, a living force manifest in every aspect of human life.

'Amal Saleh'

Understanding the Quranic term 'Amal Saleh'—righteous or good deeds—requires deep thought and reflection. The Quran includes under this blanket term all its moral and spiritual teachings including the laws of individual and social conduct. It also makes an allusion to the fact that the secret of man's real development and progress lies in performing these very acts. Righteous deeds alone can guarantee the growth of man's natural capacities and potentialities on the right lines. To quote Maulana Farahi, an eminent scholar, on this point:-

> "Almighty Allah has designated good and righteous deeds with the word 'Salehat'. This term itself guides us to the great truth that the whole of man's development and rectitude—be it outward or inner, wordly or spiritual, personal or collective, bodily or intellectual—depends upon good and righteous deeds. Righteous action is life-giving and a source of maturity and

the urge to promote the right and to destroy the wrong, is a gross immorality in itself.

Moral righteousness, according to the Quran and the teachings of the Holy Prophet, is an organic whole. Every single element of it appears living and meaningful when intact with the basic underlying grid, the life impulse of '*iman*'. When we take out a part, we negate and nullify the entire edifice of righteousness. To pass a moral judgment on a man, we shall have to take into account his total behaviour, character and beliefs, not just a few discrete actions.

The Quran places equal emphasis on the sensate and the transcendental yearnings of man, and harmonises them; and thus it lays down for humanity a comprehensive Ideal which consists in the cultivation of: (i) Piety based on a dynamic, vibrant and living faith in God, an earnest and courageous pursuit of Truth, and an ever-present consciousness of Final Accountability; (ii) sound and comprehensive Morality; (iii) social, economic and political Justice; and, finally, Knowledge in all its dimensions,—all of these resulting in the conquest of harmful and vicious propensities within the individual, the conquest of evil within the society, and the conquest of the treasures of physical environment or Nature. In the pursuit of this Ideal, moral virtue, love for humanity, truth, justice, beauty, discipline and progress are the watchwords, while the concept of Unity permeates the entire movement towards the Ideal.

The range of morality in Islam is so inclusive and integrative that it combines at once faith in God, religious rites, spiritual observances, social conduct, decision making, intellectual pursuits, business transactions, habits of consumption, manners of speech, and all other aspects of human life. Because morality is such an integral part of Islam, the moral tone underlies

A Whole Life-Pattern

A very important truth that one gets from a perusal of the above 'Ayah Birr' is that the Quranic definition of moral righteousness and virtue depicts a whole life-pattern that may not be reduced or adulterated. According to the Quran, moral behaviour is essentially a function of the total human person or spirit. And by 'spirit' the reference is here to the dynamic unity of body and mind, of vitality and rationality, of the emotional and the intellectual. In every function of the human spirit the whole person is involved, and not merely one part or one element. All elements of man's being participate in every moral decision and action. In this sense righteousness admits of no division: it is an expression of the total personality of a man. This becomes clear when we concentrate on the first part of the verse in which moral worth or value has been negated in respect of a particular type of action performed ritualistically. Whereas the positive declaration starts with the words 'righteous is he .....' or 'righteousness is of that person .....'

Matter (or desire) is not an antidivine principle from which the soul has to be liberated. Islam leads man towards a consciousness of moral responsibility in everything he does, whether great or small. The well-known injunction of the Gospel: 'Give Caesar that what belongs to Caesar, and give God that what belongs to God'—has no room in the ethical structure of Islam, because Islam does not allow a differentiation between the 'moral' and 'practical' requirements of our existence. Hence the intense insistence on action as an indispensable element of morality. Moral knowledge, according to the teachings of the Quran, automatically forces a moral responsibility upon a man. A mere Platonic discernment between right and wrong, without

In order to emphasise the importance of benevolence and kindness in the moral life, Quran projects them into the very being of God. "Be good to others as God is good to you" (28:77). God, according to the Quran, is just, merciful and kind. It is this benevolence or *'ihsan'* which helps to bring about greater cohesion, greater harmony, and greater cooperation among members of a society.

Practical deeds of charity are of value when they proceed from the love of God and from no other motive. In this respect also we must stick to the logical order mentioned very elaborately in the above quoted ayah 'Birr': our kith and kin; orphans (including any persons who are without support or help); people who are in real need but who never ask (it is our duty to fined them out, and they come before those who ask); the stranger, who is entitled by laws of hospitality; the people who ask and are entitled to ask, i.e., not merely lazy beggars, but those who seek our assistance in dire necessity in some form or another, (it is our duty to respond to them); and the slaves, (we must do all we can to give or buy their freedom). Moreover, charity and piety in individual capacity do not complete the moral obligation. Both in prayer and charity, we must look to our organised efforts as well. Where there is a Muslim state, these are made through the state, facilities for public assistance, and for the maintenance of contracts and fair dealings in all matters. Indeed, according to the Quran, actual generosity and compassion is a duty to others. But the cultivation and maintenance of the spirit and the attitude of generosity is a duty towards self because of the purity and enrichment that it acquires thereby. It is this spirit and this attitude that have been emphasised together with actual benevolence in the above quoted verse.

same, and has been always the same, in all human beings, of whatever race or tribe or country. This is implied in the fact that Divine Law relating to the 'ideal nature' has been revealed to all the communities of the world at one or the other period of human history. As a matter of historical fact, it is confirmed by the observation that basic moral concepts have been the same in different civilisations and different ages—their apparent differences consisting basically in the imperfect understanding of those concepts, or in their application to concrete problems of life.

Benevolence—The Foremost Moral Virtue

We must clearly appreciate the true connotation of the word *birr* or righteousness in the light of the above quoted Quranic verse. A righteous or moral person, accordingly, is not one who offers suprarogatory prayers or engages in sufi practices or meditation. Rather, a righteous person is one who is benevolent and compassionate to others. An inconsiderate, cruel and miser person thus cannot be a morally virtuous man. The natural outcome of faith and belief in the unity of God is the love of creation.[12] The essence of Islam is to serve Allah and do good to one's fellow creatures. This is wider and mere comprehensive then 'Love God and love your neighbour'. For it includes duties even to animals as our fellow creatures, and emphasizes practical service rather than more sentiment. Kindness and humane treatment of those who are dependent on us, love to our neighbours and children are essential according to the Quranic moral law. It is this element of loving-kindness which helps sustain the poor and unfortunate sections of society at par with the rich. It is this moral provision which cuts at the root of class struggle. The poor members of the society and one's relations have a natural right of protection and support, so that mere lack of opportunity may not ruin their general welfare.

"..... and afterwards We reduced him to the lowest of low: with the exception of those who have faith and do good works," (106:4)

Thus, according to the Quran, evil never is essential or even original; it is a later acquisition and is due to a misuse of the innate, positive qualities with which God has endowed every human being. The moral law, as distinguished from the political law, is surely a law that our own moral consciousness—our own conscience, and not any other factor, should make us incline to obey. It should form the behest of our higher self. Yet moral law should not be accepted as merely self-imposed, because the self can also dispense with it even as it can impose. Consequently it should be combined with the element of absolute authority, and such an authority can only be the authority of God. For the Muslim, the intermediary between man and God is righteousness. And Islamic *Sharia* is the supreme expression of that righteousness. Being of divine origin should not be taken to mean, according to the Quranic teaching, that the Divine Law is foreign to the nature of man and is merely thrusted from outside on him by God to be obeyed. Rather, it is simultaneously the 'Divine Law' as well as the 'Law of ideal Human Nature' and constitutes therefore the very behest of the higher human self.

The identity of the 'Divine Law' and the 'Law of the ideal Human Nature' has been explicitly proclaimed thus in the Quran:

"So set thy purpose for religion as by nature[9] upright—the nature (framed) of Allah in which He hath created the human beings.[10] There is no altering the laws of Allah's creation. That is the right religion, but most men know not".[11] (30: 30)

Here it should be noted that the 'ideal nature' is the

"Give up whatever pricks your heart". (al-Bukhari)

The moral act as the self-actualization of the centred self or the constitution of a person as a person, has analogies in the living beings. The analogy to the diminution or loss of centredness is the psychosomatic phenomena of disease. The analogy between the antimoral act and bodily disease is in many cases more than analogy. The Quran also employs this and calls an immoral act the symptom of a diseased and morbid heart. In other words, the process of self-integration are continuously combated by movements towards disintegration. This means that the moral act is always a victory over disintegrating forces and that its aim is the actualization of man as a centred, composed and healthy person.

In Islam, man by nature (i.e., *fitrah*) has an awareness of the universally valid moral norms. To every man this awareness is potentially given, even though actually distorted by culture, education, and his existential estrangement from his true being. The Divine law is creatively present both in the laws of nature and in the natural moral laws of the human mind. A man who performs morally vicious actions, feels a consciousness of estrangement from, and contradiction of, his essential being. According to the Quran, the original nature of man is essentially good. Contrary to the Christian idea that man is born sinful, or the teachnigs of Hinduism that he is originally low and impure, the Islamic teachings contend that man is born pure and in the best of mould. The Quran says:

"Surely We created man in the best structure"——but in the same breath the verse continues:

Muslim's faith in God is not merely a matter of verbal profession, he must realise the Presence and Goodness of God. When he does so the scale fall from his eyes; all the falsities and glittering nature of the material existence case to enslave him: he sees God's working in His world and in himself. Once a man is emancipated from everything but God, he arrives at a stage of development where he feels perfect repose. He finds his Lord as all loving and all merciful. He sees God's wisdom at work everywhere and becomes his instrument of action in every sphere of life. Inspired by the idea that God is sufficient unto him, he moves to action. Freed as he is from fear, he ventures on every virtuous action and meets with success. The energising words of the Quran which declare that the entire heavens and earth are made subservient to him ring in his ears and encourage him. Egotism, lust and greed touch him not, and he moves forward by the dynamic force of the Quranic message of peace, equality and fraternity.

"Birr"—or Personal Centredness of a Person

The Term 'Birr' (بِرّ) is derived from the root (ب ر ر) which means Godliness, righteousness, probity, kindness, charitable gift. The semantic constitution of this term seems to be similar to that of 'salih' which I shall discuss in the later part of this study. A very important clue to the subtle meaning of this word is provided by concentrating on another meaning of this word and contrasting it with its opposite, viz., land or ground and ocean. In this sense these locutions are also used in Urdu : 'barr' and 'bahar'.[8] It is common knowledge that when a person sets his feet on shore after a long sailing in rough seas he feels a great relief. He is never sure of his safety in the ocean, but he feels sure-footed and comfortable when he has landed on the ground. This very sense of righteousness (or charity) has been beautifully conveyed thus by the Prophet's saying:

indifference, are distateful, offensive, and displeasing to God.[6]

In the verse quoted above there is a comprehensive and clear description of the righteous man. He should obey all the salutary regulations, and should make his sincere motive the love of God and the love of his fellow man for the sake of God. Here we have four elements of righteousness : *(a)* One's faith should be true and sincere, (*b*) one should be prepared to show it in deeds of charity and kindness to fellow men, (*c*) one must be a good citizen by supporting charitable institutions and social organizations, and (*d*) one must be steadfast and unshakeable in all circumstances. It is clear, therefore, that righteousness is not merely a matter of void utterances, it must be found on strong Faith and constant practice. It must cover the person's thinking and action and extend to his inside and outside life, to his individual and social affairs. When the Islamic principle of righteousness is established, it provides the individual with peace in all circumstances, the society with security on all levels, the nation with solidarity, and the international community with hope and harmony. How peaceful and enjoyable life can be when people implement the Islamic concept of righteousness!

According to the latest researches of psychologists, human moral character is a system of such beliefs and convictions that guide the actions of an individual and distinguish him from other.[7] Actions are caused by motives. The sources of motives are thoughts and beliefs which a man acquires from the experiences of his life, his education and other sources as well. The knowledge provided by the Quran or "scientia intuitiva" is the certain knowledge that there is no object worthy of adoration or Ideal to be pursued save God. The believer turns to God as his only point of reference and approaches Him in joy or sorrow, hope or fear. A true

religious people, turn to secular ethics. Islam, on the other hand, always warns against superficial concepts and rituals, against lifeless formalities and non-effective beliefs.

The concept of morality in Islam centres around certain basic metaphysical beliefs and principles. Among these are the following :

1. God is the creator and Source of all goodness, truth and beauty.
2. Man is a responsible, dignified, and honorable agent of his Creator.
3. By His Mercy and Wisdom, God does not expect the impossible from man or hold him accountable for anything beyond his power. Nor does God forbid man to enjoy the good things of life.
4. Moderation, practicality, and balance are the guarantees of high integrity and sound morality.
5. Man's ultimate responsibility is to God and his highest goal is the pleasure of his Creator.

The dimensions of moral righteousness in Islam are numerous, far reaching and comprehensive. The Islamic morals deal with the relationship between man and God, man and his fellow-men, man and other elements and creatures of the universe, man and his innermost self. A Muslim has to guard his external behaviour and his manifest deeds, his words and his thoughts, his feelings and intentions. In a general sense, his role is to champion what is right and fight what is wrong, seek what is true and abandon what is false, cherish what is beautiful and wholesome and avoid what is indecent. Truth and moral virtue are his goal. Humility and simplicity, courtesy and compassion, are his second nature. To him, arrogance and vanity, harshness and

human dispositions?' and 'What is the golden mean that secures the highest good attainable?'

'Birr' or Righteousness

Among all the ethical terms used in the Quran such as *'Ihsan'*, *'Sidq'*, *'Adl'*, *'Khair'*, *'Ma'ruf'*, the most comprehensive and perhaps the most representative of an ideal moral action is the term *Birr,* which will be discussed here not so much in its semantic meaning but in its broader sense in which it is used in the Quran as the definition of ethical virtue and moral righteousness. Let me quote the English translation of the verse 177 of Surah al-Baqarah in which this is explicated at length :

> "It is not righteousness (Birr) that you turn your faces towards the East and the West, but righteous is he who believes in Allah, and the Last Day, and the angels and the Book and the Prophets, and gives away wealth out of love for Him, to the near of kin and the orphans and the needy and the wayfarer and to those who ask, and sets slaves free and keeps up prayer and pays the alms (Zakat) ; and those who honour or fulfil their contracts when they make a contract, and remain patient in distress and affliction and in the time of panic and conflict. These are they who are truthful and these are they who are God-fearing".

In the first part of this verse a particular view of moral rectitude and righteousness has been negated, that of pure formalism and ritualism. Some devoutly religious persons exhibit this attitude when they assign utmost importance to outward appearance of moral and religious observances to the total neglect of their inner spirit and meaning. Quite understandably many people, as a reaction to the ritualistic soulless moralism of

Creator but towards himself and towards his fellow-beings. It offers a complete coordination of the spiritual and material aspects of human life, lays down a practical code and demands a righteousness well within the realm of practicability. It does not subscribe to materialistic trends but rouses in man a consciousness of moral responsibility in everything he does. There is no sphere of life, no conscious activity of man, which may be outside the pale of Islamic morality. If it falls in line with the divine prescriptions and the ethical code, almost every temporal act is given a spiritual touch and raised to the status of worship (*Ibadat*), attracting rewards and the pleasure of God. Good morals in Islam are divine attributes and it is demanded of us to recreate them in ourselves as far as our humanity allows. A tradition of the Prophet says:

"Let the virtues of God by your virtues". (al-Bukhari)

(j) From the concept of normative or exemplary conduct there follows the concept of standard or correct conduct as a necessary complement. Righteous behaviour, in Islam, is formalized by the Prophet's example, his *'Sunnah'*.

In the behavioural pattern of the Prophet (peace be upon him) righteousness and virtue appears in an embodied form. An abstract passion for piety and righteousness may assume devilish form and proportion and eventually end up in something vicious and degenerate. The sense in which *sunnah* is a straight path without any deviation to the right or to the left also gives the meaning of a 'mean between extremes' or the 'middle way'. The Prophet's life provides perfect answers to the questions : 'What are the undesirable extremes in

improvement in the behaviour of man and his control over natural forces, is neither pessimism nor optimism and is animated by the hope of man's eventual victory over evil.[4] Earthly life is of tremendous value; but it is of a purely instrumental value. In Islam there is no room for the materialistic optimism of the modern West which says : 'My kingdom is of this world alone'. The Quran teaches us to pray :

> "Our Lord! give us the good in this world and the good in the Hereafter". (2 : 201)

Thus the full appreciation of this world and its goods is in no way a handicap for our religio-moral endeavours. Material prosperity is desirable, though it is not a good in itself.

(h) *Morality,* culture and religion, according to some influential theological ethical philosophers who agree with the Quranic approach, are the three functions of the human spirit.[5] None of these functions of the spirit ever appears in isolation from the other two. The moral imperative, in so far as it has an unconditional and self-transcending character, assumes a religious dimension. A decision or action is moral only when it spring from the 'pure ought to be' of the moral imperative. In this way not only the content but also the unconditional character of the moral imperative would have to be sanctioned by a divine command.

(i) Islam is not only a spiritual attitude of mind or a code of sublime precepts but a self-sufficing orbit of culture and a social system of well-defined features. In fact, it is an all-embracing code of life establishing, on a systematic and positive base, the fundamental principles of morality and precisely formulating the duties of man not only towards his

moral righteousness or piety is inalienable from human life. On deeper analysis it would become clear that even socially undesirable elements have a sense of righteousness and observe a code of ethics to gratify it. *Pace* Durkheim, a minimal sense of ethics (good, virtue) is unavoidable, and hence his notion of 'anomie' or a state of normlessness is a pure fiction.[2]

(f) The ultimate justification of morals depends on the idea of man's intrinsic aim, the *telos* for which he is created . If the aim implies something above finitude and transitoriness, the fulfilment of this aim is infinitely significant. When Plato said that the *telos* of man is 'to become as much as possible similar to the God', such a *telos* gives utmost depth to the moral imperative. Again, if the object of our life as a whole is the worship of God, then we necessarily must regard this life, in the totality of all its aspects, as one complex moral responsibility. Thus all our actions, even the seemingly trivial ones, must be performed as acts of worship.

(g) Disgusted with the Buddhist or 'Tayag' doctrine of pessimism that this world is full of evil and consequently no good can come out of it, some thinkers have taken refuge in the opposite extreme of optimism. The Quran, on the other hand, advocates neither the one nor the other.[3]

"To the optimist Browing", writes Allama Iqbal in his *Reconstruction of Religious Thought in Islam*, "all is well with the world ; to the pessimist Schopenhauer the world is one perpetual winter wherein a blind will expresses itself in an infinite variety of living things which bemoan their emergence for a moment and then disappear for ever . . . The teaching of the Quran, which stands for the possibility of

that nature, the human soul, is not a biological entity. Ethical matters, accordingly, are part of an ontology and not part of a sociology or 'social engineering'.

(c) Islam, being based on transcendental conceptions, regards the existence of a soul as a reality beyond any discussion. Though certainly not opposed to each other, material and spiritual progress are, according to the Quran, two distinctly different aspects of human life. They may exist side by side, and again they may not. While clearly admitting the possibility, and even desirability of material progress of believers, Islam clearly denies the possibility of moral and spiritual improvement of humanity by means of its collective material achievements.

(d) In Islam, the first and foremost goal is the inner, moral progress of man, and therefore the ethical considerations overrule the purely utilitarian. In the contemporary world the situation is unfortunately just the opposite. The consideration of material utility and physical comfort dominates all manifestations of human activity, and ethics are being relegated to an obscure background of life and condemned to merely a theoretical position without the slightest power of influencing the human community.[1]

(e) Ethics constitutes an essential aspect of man's intrinsic nature : it is part of his ontological substance. The sense of right and wrong fulfils a psychical demand emanating from a man's inner being, just as water and air fulfil our basic needs for physical existence. The inner non-corporeal component of man—the spiritual core or soul—requires nourishment through gratification of its moral demands. In this sense, some conception of

ETHICAL VIRTUE
IN THE QUR'ANIC PERSPECTIVE

Absar Ahmad

In this paper I intend to discuss briefly and schematically the question of moral virtue or righteousness with special reference to the words *Birr* and *Saleh* as the key ethical terms used in the Quran. It would, however, be helpful first to make a few general observations regarding the Quranic approach to human life and the importance of his moral endeavour.

(a) Islam, as every unbiased student of history knows, wrought an epoch-making and the most wonderful transformation in the laws of thought, principles of life and criterion of values of mankind. This much needed and most welcome revolution was based upon those fundamental principles which are, in reality, the *raison d'etre* of Islam itself, viz., God-consciousness, sense of human dignity and the moral principle of human equality.

(b) Atheistic ideologies and humanistic ethics believe in the possibility of a progressive moral improvement of mankind, in the collective sense, by means of their practical achievements and the development of scientific thought. The Islamic viewpoint is, however, diametrically opposed to this conception of human evolution. Islam has never accepted, as the secular utilitarian/pragmatic philosophies do, that the human nature—in its general supersensible sense—is undergoing process of progressive change in a similar way as a tree grows: because the basis of

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلۂ اقبالیات میں "بقامتِ کہتر و لے بقیمتِ بہتر" کی مصداقِ کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علّامہ اقبال اور ہم

جو کئی سال سے آؤٹ آف پرنٹ تھی،

اب اس کتاب کا نیا نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن نئی آب و تاب کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آ چکا ہے، جس میں مندرجہ ذیل نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے :

- فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ اور ہماری ذمہ داریاں
  از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد
- حیات و سیرتِ اقبال
- فلسفۂ اقبال
- ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام
  از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم
- اقبال اور قرآن، از قلم : سید نذیر نیازی

عمدہ کتابت، دیدہ زیب طباعت، صفحات ۱۴۴

قیمت : اشاعت خاص (سفید کاغذ، پائیدار و خوبصورت جلد) ۷۲ روپے

اشاعت عام (نیوز پیپر ایڈیشن) ۳۰ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن